الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

اپنی سرگرمیوں میں دوسروں کا لحاظ نہ کرنا
صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ
دوسرے بھی اپنی سرگرمیوں میں آپ کا لحاظ نہ کریں

دسمبر ۱۹۹۱ ▫ شمارہ ۱۸۱ ▫ ۵ روپیہ

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ـ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ـ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۱، شمارہ ۱۸۱

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATTIC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60, Abroad US $ 25 (Air Mail)

نماز کی حقیقت

یہ عصر کی نماز تھی۔ امام نے نماز پوری کر کے سلام پھیرا، تھوڑی دیر بیٹھے اور اس کے بعد دعا کر کے اٹھ گئے۔ ایک مقتدی نے امام صاحب کو روکا۔ اور تضحیک کے انداز میں بولے: "عصر کی نیت کی تھی یا ظہر کی"۔ یہ سن کر تمام نمازی ہنس پڑے جو پہلے ہی سے امام صاحب کو عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مذکورہ مقتدی سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "عصر کے وقت تسبیح (فاطمہ) پڑھی جاتی ہے۔ مگر امام صاحب نے تسبیح پڑھے بغیر دعا کر لی اور اٹھ گئے"۔ خیریت یہ ہے کہ امام صاحب نے کسی قسم کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ اپنے حجرہ میں چلے گئے۔ اگر انھوں نے کوئی تیز جواب دیا ہوتا تو یقیناً بات بڑھتی اور زبانی تنقید باقاعدہ ہاتھاپائی میں تبدیل ہو جاتی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آج کل نماز کا کیا حال ہے۔ وہ نماز کو صرف اس کے ڈھانچے کے اعتبار سے جانتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ کچھ لوگ "مسنون" ڈھانچہ کو نماز سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں نے مبتدعانہ طور پر اس میں کچھ غیر مسنون چیزوں کا اضافہ کر لیا ہے۔

نماز کا بلاشبہ ایک ڈھانچہ ہے۔ مگر نماز کی اصل حقیقت اس کی اندرونی اسپرٹ ہے، اور یہ اندرونی اسپرٹ خشوع ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کی نماز میں ظاہری ڈھانچہ ہو مگر اس میں خشوع کی کیفیت نہ پائی جائے تو ایسی نماز حدیث کے مطابق نماز ہی نہیں (لا صلوٰۃ لمن لم یتخشع)

ڈھانچہ والی نماز اور خشوع والی نماز کی ایک پہچان یہ ہے کہ جو آدمی ڈھانچہ والی نماز پڑھے، اس کی نظر دوسرے کی نماز پر ہوتی ہے۔ اور جو آدمی خشوع والی نماز پڑھے اس کی نظر اپنی نماز پر۔ پہلی قسم کا آدمی دوسروں کی نماز میں "ٹکنکل" خامی نکال کر ان کے خلاف تقریر کرے گا۔ اور دوسری قسم کا آدمی خود اپنی نماز کی کمیوں کو سوچ کر چپ رہے گا۔ وہ اپنے احتساب میں اتنا زیادہ مشغول ہوگا کہ اس کو یہ فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ دوسروں کی نماز پر تبصرہ کرے۔

نماز اللہ کی یاد کا نام ہے، اور اللہ کی یاد کسی آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کو خشوع کہا گیا ہے۔

ارکان اسلام

عن عبد الله بن عمر قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔ بُنی الاسلام علیٰ خمس۔ شھادۃ أن لا الٰہ الا اللہ و أنّ محمداً عبدُہ و رسولُہ واقام الصلاۃ و ایتاء الزکاۃ والحج وصوم رمضان (متفق علیہ)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق، اسلام میں پانچ چیزیں ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ بنیادی ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان دراصل پانچ اصول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کو ان پانچ اصولوں پر قائم کرے۔

کلمۂ شہادت کا مطلب خدا کی خدائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک آدمی خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اقرار کرتا ہے کہ خدا نے ان کو تمام انسانوں کا ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ ہر سچائی کے اعتراف کے لیے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی چیز حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے۔

نماز کی اصل تواضع ہے۔ جس آدمی کے اندر نماز کی حقیقت پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا، اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا۔

زکاۃ کی حقیقت خدمت خلق ہے۔ جس آدمی کے اندر فی الواقع زکاۃ کی روح پیدا ہو جائے وہ تمام انسانوں کا خیر خواہ بن جائے گا، وہ ہر ایک کے لیے مفید بن کر زندگی گزارے گا۔

حج کی حقیقت اتحاد ہے۔ جو آدمی سچے جذبہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرلے اس کے اندر اختلاف کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا۔

روزہ کی حقیقت صبر ہے۔ جو آدمی سچا روزہ دار ہو، وہ اسی کے ساتھ لازماً صبر دار بھی ہوگا۔ اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناگواریوں کو برداشت کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔

عفو و تواضع

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عبادت کے وہ طریقے بتائے جن کو اپنا کر آدمی اللہ کی نظر میں پسندیدہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح آپ نے وہ اخلاقی اصول بھی بتائے ہیں جن کو اگر اختیار کر لیا جائے تو انسان دوسرے انسانوں کے درمیان عزت اور سربلندی کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

وما زاد اللہ عبداً بعفو الا عزاً، وما تواضع احد للہ عز وجل الا رفعہ اللہ تعالیٰ (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۸۴)

اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی صرف عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے اس کو اللہ تعالیٰ صرف اونچا ہی کرتا ہے۔

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص برائی کرے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے تو وہ دلیر ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ برائی کرے گا۔ مگر حدیث رسولؐ اس کے برعکس یہ بتاتی ہے کہ جو شخص برائی کرنے والے کو معاف کر دے تو اس کے بعد معاف کرنے والے کی عزت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

اسی طرح عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کبھی جھکنا نہیں چاہیے۔ اگر جھکے تو لوگ اور زیادہ جھکانے کی کوشش کریں گے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم تواضع کا انداز اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے تم کو اور زیادہ سربلندی حاصل ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عفو اور تواضع کا طریقہ فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اندر انسان کو مسخر کرنے کی طاقت ہے۔ وہ انسان کو اندر سے زیر کر دینے والا ہے۔ جو شخص عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے اس نے گویا اس فطرت کو مخاطب بنایا جو ہر آدمی کے اندر اس کے خالق نے رکھ دی ہے۔ جو عین اپنی سرشت کے مطابق حق کے آگے جھکنے اور صاحب حق کا اعتراف کرنے کا مزاج رکھتی ہے۔

فطرت فریق ثانی کے اندر آپ کا نمائندہ ہے۔ جب آپ عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے اس نمائندہ کو آپ اپنی حمایت میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ طاقت ور حمایت کیا ہو سکتی ہے کہ خود فریق ثانی کے اندر آپ کا ایک حامی کھڑا ہو جائے۔

اپنے خلاف

غفار، اسلم، جُهَینہ، مُزَینہ، خُزاعہ، قدیم عرب کے قبائل تھے۔ وہ سماجی اور معاشی اعتبار سے کمتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ذریعہ معیات زیادہ تر جانوروں کو چرانا اور ان کی پرورش کرنا تھا۔ ان قبائل کے کچھ افراد نبی دور میں ایمان لائے تو قریش کے معزز لوگوں نے کہا:

لوکان ماجاء بہ محمد خیراً ماسبقتنا الیہ رُعاۃ البَہم اذ نحن اعز منہم

(الجامع لاحکام القرآن، ۱۶/۱۹۰)

محمد جو کچھ لائے ہیں، وہ اگر خیر ہوتا تو اس کو قبول کرنے میں جانوروں کو چرانے والے ہم سے آگے نہ رہتے جب کہ ہم ان سے زیادہ باعزت ہیں۔

مکہ میں جن لوگوں نے آپ کو مانا اور آپ کے ساتھی بن گئے، ان میں ایک تعداد غلاموں کی تھی۔ مثلاً بلال، عمار، صہیب، خباب، وغیرہ۔ ان کے سلسلہ میں بھی قریش کا کہنا یہی تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مکہ کے انکار کرنے والے ایمان لانے والوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو وہ اس کو قبول کرنے میں ہم پر سبقت نہ لے جاتے (الاحقاف ۱۱)

یہ بات درست ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں معمولی حیثیت کے لوگ بھی شامل تھے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ کے ساتھیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اونچی حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً ابوبکر بن ابی قحافہ، عثمان بن عفان، وغیرہ۔ مگر آپ کے مخالفین یہ کرتے کہ وہ پہلی قسم کے لوگوں کا ذکر کرکے آپ کے کام کی تحقیر کرتے۔ وہ دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

آدمی کو جب کسی سے ضد ہو جاتی ہے تو وہ یہی طریقہ اپناتا ہے۔ وہ اس کے بارہ میں یک رُخا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے مزعومہ حریف کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ اس کے صرف ان پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے جس میں اسے اپنے حریف کی تحقیر کا موقع مل رہا ہو۔

جو لوگ یہ طریقہ اختیار کریں، وہ دوسرے کے بارہ میں کچھ ثابت نہیں کرتے۔ البتہ خود اپنے بارہ میں ضرور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ راہ راست پر نہیں ہیں۔ کیوں کہ جو آدمی راہِ راست پر ہو اس کا طریقہ عدل وانصاف کا طریقہ ہوتا ہے نہ کہ ظلم اور تعصب کا طریقہ۔

آدمی سب سے زیادہ اس وقت پہچانا جاتا ہے جب کہ اس کو کسی سے اختلاف پیدا ہو جائے۔

انعام سے محروم

ایرانی شاعر فردوسی طوس میں ۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۰۲۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ فردوسی نے ۳۰ سالہ محنت سے وہ منظوم کتاب تیار کی جو شاہنامہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ۶۰ ہزار اشعار ہیں اور اس میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے احوال بتائے گئے ہیں۔ فردوسی نے یہ کتاب سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ محمود غزنوی نے خوش ہو کر فردوسی کو ۶۰ ہزار سونے کا سکہ دینے کا حکم دیا۔ مگر فردوسی شیعہ تھا۔ سلطان کے سُنّی وزیر احمد بن حسن میمندی کی ایک سازش کے تحت فردوسی کو سونے کے سکہ کے بجائے چاندی کے ساٹھ ہزار سکے پیش کیے گیے۔ فردوسی کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ اس نے انعام کی رقم وہیں لوگوں میں تقسیم کر دی اور خالی ہاتھ گھر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے سلطان محمود غزنوی کی "ہجو" میں ایک نظم لکھی۔

فردوسی کے واپس جانے کے بعد ایاز کے ذریعہ یہ ہجو سلطان کو ملی۔ اس ہجو کے ذریعہ سلطان کو اپنے وزیر کی سازش کا علم ہوا۔ اس نے وزیر کو قید کر دیا اور اپنے خاص آدمی کے ذریعہ دوبارہ ۶۰ ہزار سونے کے سکے فردوسی کے لیے روانہ کیے۔ مگر فردوسی کے لیے اپنے شاہنامہ کا مطلوبہ انعام پانا مقدر نہ تھا۔ انعام کی رقم اس کے وطن اس وقت پہونچی جب کہ فردوسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوتے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ انعام کی رقم طوس حفاظت کے ساتھ پہونچ گئی مگر اشرفیوں سے لدے ہوئے اونٹ جس وقت شہر کے ایک دروازے سے داخل ہو رہے تھے، فردوسی کا جنازہ دوسرے دروازہ سے قبرستان لے جایا جارہا تھا:

The indigo reached Tus in safety; but as the camels were entering the town by one gate, Ferdowsi's bier was being carried out through another (7/234).

فردوسی کی یہ کہانی ہر آدمی کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی محنت کرتا ہے۔ وہ ساری عمر محنت کرکے ایک کام کرتا ہے۔ مگر جب وہ وقت آتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی اس محنت کا آخری انعام پائے تو موت اس کو موجودہ دنیا سے جدا کر دیتی ہے وہ محنت کے باوجود اپنی محنت کا انعام پانے سے محروم رہتا ہے۔

جو لوگ آخرت کے لیے محنت کریں، جو دنیا کو دار العمل سمجھیں اور آخرت کو دار الجزاء۔ ایسے لوگوں کے لیے محرومی یا مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

اختیار اور بے اختیاری

مشہور سائنسداں آئن سٹین نے طبیعیاتی دنیا کے اصول کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے ——
توانائی نہ پیدا کی جاسکتی اور نہ ختم کی جاسکتی :

Energy can neither be created nor destroyed.

یہ واقعہ خالق کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے۔ انسان موجودہ دنیا کو صرف استعمال کر سکتا ہے۔ وہ اس کو بدلنے یا اس کو مٹانے پر قادر نہیں۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں مالک کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ صرف تابع کی حیثیت سے ہے۔ اسی صورت حال کو مذہب کی اصطلاح میں امتحان کہا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں صرف اس لیے آتا ہے تاکہ وہ محدود مدت میں یہاں رہ کر اپنے امتحان کا پرچہ پورا کرے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ کسی اور چیز کا اس کو مطلق اختیار نہیں۔

بعض انسان دنیا کے حالات سے مایوس ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو ختم یا معدوم کر رہے ہیں، مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح دنیا کی اُس توانائی کو مٹایا نہیں جاسکتا جو مادہ کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں اس توانائی کو مٹانا بھی ممکن نہیں جو انسان کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔ انسان کے اختیار میں خودکشی ہے، مگر انسان کے اختیار میں معدومیت نہیں۔ یہ صورت حال علامتی طور پر بتاتی ہے کہ انسان کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔

انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حقیقت واقعہ کا انکار کر دے۔ مگر حقیقت واقعہ کو بدلنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ سرکشی کرے مگر سرکشی کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی پابندی کو قبول نہ کرے مگر اخلاق کی مطلوبیت کو کائنات سے حذف کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے مگر اس کو یہ اختیار نہیں کہ اپنے چاہنے ہی کو وہ اُس معیاری اصول کی حیثیت دے دے جس کے مطابق بالآخر تمام انسانوں کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

انسان اس دنیا میں آزاد ہے، مگر اس کی آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود۔

محنت کے ذریعہ

باپسی سدھوا (Bapsi Sidhwa) ایک پارسی خاتون ہیں۔ وہ پاکستان (لاہور) کی رہنے والی ہیں۔ آج کل وہ ٹکساس (امریکہ) کی یونیورسٹی آف ہاؤسٹن میں استاد ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی لکھی ہوئی کتابیں (ناولیں) انٹرنیشنل سطح کے پبلشنگ اداروں میں چھپتی ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باپسی سدھوا کی رسمی تعلیم بالکل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے وطن لاہور کے ایک اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی تھیں کہ ان کو پولیو کی بیماری ہوگئی۔ ان کے والدین نے ان کے لیے باضابطہ تعلیم کو ناممکن سمجھ کر ان کو اسکول سے اٹھالیا۔ اس کے بعد وہ ٹیوٹر کے ذریعہ اپنے گھر پر پڑھنے لگیں۔ مگر ٹیوٹر کا سلسلہ بھی بہت زیادہ دن تک باقی نہیں رہا۔

اب باپسی سدھوا کا شوق ان کا رہنما تھا۔ وہ خود سے پڑھنے لگیں۔ وہ ہر وقت انگریزی کتابیں پڑھتی رہتیں۔ اپنے الفاظ میں، وہ کبھی سیر نہ ہونے والی قاری (Voracious reader) بن گئیں۔ آخر انھوں نے اپنی محنت سے یہ درجہ حاصل کرلیا کہ وہ انگریزی میں مضامین لکھنے لگیں۔ مگر دو سال تک یہ حال تھا کہ انھیں اپنے بھیجے ہوئے مضمون کے جواب میں صرف انکاری تحریریں (Rejection slips) ملتی تھیں۔ ان کی پہلی کتاب کا مسودہ آٹھ سال تک ان کی الماری میں پڑا ہوا گرد آلود ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے۔

آخر کار حالات بدلے۔ ان کے مضامین باہر کے میگزینوں میں چھپنے لگے۔ اب وہ عالمی سطح پر پڑھی جانے والی انگریزی رائٹر بن چکی ہیں۔ رسمی ڈگری نہ ہونے کے باوجود وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں تخلیقی تحریر (Creative writing) کا مضمون پڑھا رہی ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ فروری ۱۹۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم محنت کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ تمام ترقیاں محنت کی قیمت دے کر حاصل ہوتی ہیں۔ اور محنت وہ چیز ہے جو ہر آدمی کو حاصل رہتی ہے۔ حتی کہ اس آدمی کو بھی جس کو بیماری نے معذور بنادیا ہو، جو کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری لینے میں ناکام ثابت ہوا ہو۔

محنت ایک ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کسی کے لیے ختم نہیں ہوتا۔

تخلیقی صلاحیت

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک تعلیم یافتہ ہونے کی پہچان کیا ہے۔ پروفیسر نے جواب دیا ـــــ وہ شخص جو نہیں سے ہیں کی تخلیق کر سکے:

The person who can create thing out of nothing.

یہ تعریف نہایت صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی آدمی کے تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کی سب سے زیادہ خاص پہچان یہی ہے کہ وہ کوئی نئی چیز دریافت کر سکے۔ بظاہر "نہیں" کے حالات میں وہ "ہے" کا واقعہ ظاہر کر سکے۔

اس خصوصیت کا تعلق زندگی کے ہر میدان سے ہے۔ خواہ علم کا میدان ہو یا تجارت کا۔ سماجی معاملات کی بات ہو یا قومی معاملات کی۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں وہی شخص بڑی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو اس انسانی صلاحیت کا ثبوت دے سکے۔

اس دنیا میں آدمی کو خام معلومات سے اعلیٰ معرفت کی دریافت تک پہونچنا ہے۔ اس کو ناموافق حالات میں موافق پہلو کو دریافت کرنا ہے۔ اس کو دشمنوں کے اندر اپنے دوست کا پتہ لگانا ہے۔ اس کو ناکامیوں کے طوفان میں کامیابی کا سفر طے کرنا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ زندگی کے کھنڈر سے اپنے لیے ایک نیا شاندار محل تعمیر کر سکتا ہے۔

جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیں وہی صحیح معنوں میں انسان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ باعتبار حقیقت حیوان ہیں خواہ بظاہر وہ انسانوں جیسا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

یہ تخلیق (creativity) ہی کسی شخص یا قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہی چیز اس کو موجودہ دنیا میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ جو لوگ تخلیق کی صلاحیت کھو دیں، وہ کسی اور چیز کے ذریعہ یہاں اپنا مقام نہیں پا سکتے۔ خواہ وہ کتنا ہی شور و غل کریں۔ خواہ ان کے فریاد و احتجاج کے الفاظ سے تمام زمین و آسمان گونج اٹھیں۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کا شور تو برپا کر سکتے ہیں، مگر وہ استحکام کا خاموش قلعہ کبھی کھڑا نہیں کر سکتے۔

موت کا سفر

ایک ہوائی جہاز ایک مغربی ملک کے ایرپورٹ پر پہنچا۔ وہاں جو مسافر اترے، ان میں ایک شخص وہ تھا جس کے استقبال کے لیے وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا، جس کے بارہ میں مقامی پولیس کو پیشگی اطلاع مل چکی تھی کہ وہ ایک مطلوب مجرم ہے، چنانچہ جیسے ہی وہ ہوائی جہاز سے باہر آیا، اس کو وہاں گرفتار کر لیا گیا۔ ایک مسافر ہوائی جہاز سے نکل کر گیسٹ ہاؤس میں پہنچا، اور دوسرا مسافر جیل خانہ میں۔

یہ واقعہ تمثیل کے روپ میں اس زیادہ بڑے واقعہ کو بتا رہا ہے جو موت کے بعد ہر آدمی کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ ہر آدمی پر یہ وقت آنے والا ہے کہ ایک دن موت کے فرشتے اپنی سواری لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس وقت آدمی سے کہا جائے گا اپنے دنیوی گھر کو چھوڑ کر اس میں بیٹھو۔ آدمی مجبور ہوگا کہ وہ اس سواری میں بیٹھے۔ اس کے بعد فرشتے اس سواری کو لے کر روانہ ہوں گے۔ یہ سواری دنیا سے روانہ ہوگی اور آخرت میں پہنچ کر ٹھہر جائے گی۔

جب آدمی اپنی سواری سے نکل کر آخرت کی دنیا میں اترے گا تو کوئی شخص پائے گا کہ وہاں استقبال کے فرشتے پُرشوق انداز میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور کوئی شخص دیکھے گا کہ گرفتاری کے فرشتے وہاں اس کے منتظر ہیں۔ ایک شخص کو اعزاز کے ساتھ لے جا کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور دوسرے شخص کو مجرم کی طرح گرفتار کر لیا جائے گا، اور پھر اس کو جہنم کے عذاب خانہ میں ڈال دیا جائے گا تاکہ وہاں وہ ابدی طور پر پڑا رہے۔

ہر آدمی جو پیدا ہوا اور مر گیا، اس پر ان میں سے کوئی ایک انجام بیت چکا ہے۔ اور ہر آدمی جو زندہ ہے، اس پر ان میں سے کوئی ایک انجام بیتنے والا ہے۔ ہر آدمی دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے، اور کسی بھی لمحہ وہ اس سے دوچار ہونے والا ہے۔

یہ بلاشبہہ کسی انسان کا سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو ہر انسان کو آخری حد تک تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے کہ آدمی کو اگر واقعی اس کا احساس ہو تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

بدگمان کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور اس کی آبرو کو حرام کر دیا ہے اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارہ میں بدگمان کرے (ان اللہ حَرَّمَ من المسلم دمہ وعرضہ وان یظُنَّ بہ ظنَّ السوء، تفسیر قرطبی)

اس قسم کی ہدایات کا نتیجہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گمان قائم کرنے کے بارہ میں بے حد حساس تھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک احتیاط برتتے تھے کہ کسی کے بارہ میں غلط گمان اپنے ذہن میں قائم کریں۔ حسن بصری تابعی نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ پہلے ہم ایسے زمانہ میں تھے کہ بدگمانی کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور آج بدگمانی اتنی ہلکی چیز بن گئی ہے کہ تم کسی کے بارہ میں جو غلط رائے چاہو قائم کر لو (کنا فی زمن الظن بالناس فیہ حرام وانت الیوم فی زمن ظنّ فی الناس ماشئت)

بدگمانی اکثر اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ایک واقعہ کو غلط رنگ دیدیا جاتا ہے۔ ایک بار حضرت سلمان فارسی اور ان کے دو ساتھیوں کو کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ موجود نہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی حضرت اسامہ کے پاس گیے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خازن تھے۔ حضرت سلمان نے ان سے کھانا طلب کیا۔ مگر اتفاق سے اس وقت سب کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی کھانے کی چیز انھیں نہ دے سکے۔ حضرت سلمان جب اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف لوٹے اور ان کو قصہ بتایا تو دونوں نے کہا کہ اسامہ کے پاس کھانا موجود تھا مگر انھوں نے بخل سے کام لیا (لو کان عنده لکنہ بخل)

مذکورہ دونوں افراد اگر حضرت اسامہ کے انکاری جواب کو عذر پر محمول کرتے تو وہ بدگمانی میں نہ پڑتے۔ مگر انھوں نے ان کے جواب کو بخل سمجھا اس لیے وہ ایک صالح انسان کے بارہ میں بدگمانی میں پڑ گیے۔ اس طرح کی بدگمانی اسلام میں سراسر حرام ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنے بھائی کے بارہ میں اچھی رائے قائم کرے ورنہ خاموش رہے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا رویہ اس کے لیے درست نہیں۔

تکمیل ایمان

عن ابی امامۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَن احبَّ للّٰہ و ابغض للّٰہ وأعطی للّٰہ و منع للّٰہ فقد استکمل الایمان (رواہ ابوداؤد)

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

آدمی کلمہ کے الفاظ ادا کرکے ایمان کے دائرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ مگر اس کا ایمان اللہ کی نظر میں اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کے اندر مذکورہ خصوصیات پیدا ہوجائیں۔

آدمی کے ایمان کی تکمیل یہ ہے کہ اس کی پوری شخصیت اس ایمان میں ڈھل جائے جس کا اس نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔ ایمان کے بعد اس کی حالت یہ ہوجائے کہ اس کے جذبات کا مرکز ومحور ایک اللہ کی ذات بن جائے۔ وہ کسی کو چاہے تو خدا کے لیے چاہے۔ کسی کو نہ چاہے تو خدا کے لیے نہ چاہے۔ کسی کو کچھ دے تو خدا کے لیے دے اور کسی کو دینے سے رکے تو اس لیے رکے کہ خدا نے اس کو دینے سے منع کیا ہے۔

دنیا میں آدمی کی پوری زندگی انھیں چیزوں کے تحت گزرتی ہے۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت، وہ اپنا اثاثہ کسی کو دیتا ہے اور کسی کو دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہ محبت اور نفرت اور یہ دینا اور نہ دینا اگر اپنی ذاتی پسند کے تابع ہو تو وہ غیر مومنانہ روش ہے اور اگر وہ خدا کی مرضی کے تابع ہو تو اسی کا نام مومنانہ روش ہے۔

اس معاملہ میں کوئی شخص جتنا زیادہ اپنے رویہ کو خدا کے ماتحت کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ کامل ہوتا چلا جائے گا اور جتنا زیادہ اس معاملہ میں وہ کمی کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے نزدیک ناقص قرار دیا جائے گا۔

آدمی اس دنیا میں اپنے تمام معاملات محبت اور نفرت کے جذبہ کے تحت کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اس محبت اور نفرت کا اللہ کی مرضی کے تابع ہونا مومنانہ روش ہے، اور اس محبت اور نفرت کا ذاتی خواہش کے تابع ہونا غیر مومنانہ روش۔

بے خبری

امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) لبنان میں پیدا ہوئے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھے۔ پہلی بار جب ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی تو انھوں نے امیر شکیب ارسلان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر کہا: انا اهنئ ارض الاسلام التی انبتتك (میں اس اسلامی سرزمین کو مبارکباد دیتا ہوں جس نے تم کو جنم دیا)

امیر شکیب ارسلان عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے یورپ کے ملکوں کا دورہ کیا اور وہاں عرصہ تک مقیم رہے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مطالعہ سے زیادہ کوئی چیز مجھے اس دنیا میں محبوب نہیں۔ ایک ظریف نے کہا ہے کہ میں انگور کھانے سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میرے پیٹ میں تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی طرح میں مطالعہ سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میری آنکھوں میں جلن کیوں نہ پیدا ہو جائے (ذکری الامیر شکیب ارسلان، صفحہ ۲۴)

امیر شکیب ارسلان کی آخری دریافت یہ تھی کہ مغرب کا سیاسی استعمار عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ ساری عمر مغربی استعمار کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ مجلہ السیاسۃ (بیروت) میں ایک بار ان کے ایک ہمدرد نے انھیں مشورہ دیا کہ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ استعماری حکومتوں سے مصالحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کام کیا جائے۔ اس پر امیر شکیب ارسلان بگڑ گئے اور السیاسۃ میں سخت تردیدی مضمون شائع کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امیر شکیب ارسلان کا نشانہ پورا ہو گیا۔ تمام مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ مگر عملی صورت حال میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ مغرب کی بالادستی اب بھی زیادہ طاقتور انداز میں قائم ہے۔ حتی کہ ہمارے جن بزرگوں نے مغربی استعمار کو سب سے بڑی برائی سمجھ کر ان کے خلاف سیاسی جہاد کیا تھا، ان کی اولاد دوبارہ بھاگ بھاگ کر انھیں مغربی ملکوں میں جا رہی ہیں تاکہ اپنی بہترین صلاحیت کو ان "اسلام دشمنوں" کی خدمت کے لیے وقف کر سکیں۔

امیر شکیب ارسلان اور ان کے جیسے لوگ ان حقائق کو سمجھنے سے کیوں عاجز رہے۔ اس کی وجہ ان کی بے خبری تھی۔ انھوں نے ادب جیسی چیزوں کا مطالعہ کیا، مگر انھوں نے تاریخ اور سائنسی علوم کا زیادہ گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ نہ زمانۂ حاضر کو سمجھ سکے اور نہ وقت کے مطابق قوم کو رہنمائی دینے میں کامیاب ہوئے۔

نصیحت لقمان

قرآن کی سورہ نمبر ۳۱ کا نام لقمان ہے۔ اس سورہ میں لقمان حکیم کا ذکر ہے اور ان کی وہ نصیحت نقل کی گئی ہے جو انھوں نے غالباً اپنی آخر عمر میں اپنے بیٹے کو کی تھی۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے :

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر کرو، اور جو آدمی اللہ کا شکر کرے تو وہ اپنے ہی لئے شکر کرتا ہے۔ اور جو آدمی ناشکری کرے تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے، اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اور ہم نے انسان کو اس کی ماں اور باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا، کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو تم ان کی بات کو نہ ماننا۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا۔ اور تم اس آدمی کے راستہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے۔

لقمان نے کہا کہ اے میرے بیٹے، کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر ہو، پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے، نماز قائم کرو، اچھے کام کی نصیحت کرو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر، اور زمین میں اکڑ کر نہ چل بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۲ - ۱۹)

حضرت لقمان کی شخصیت کی تاریخی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے۔ البتہ ایک صالح اور حکیم انسان تھے۔ ایک رائے کے مطابق، وہ سیاہ فام حبشی تھے اور ان کا زمانہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان لائے ہوئے

تھے اور مومن وصادق تھے۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ربانی حکمت بھی عطا فرمائی تھی۔

حکم یا حکمت سے مراد فہم اور بصیرت ہے۔ ایک ہے دین کی معلومات ہونا، دوسری چیز ہے دین کی معرفت ہونا۔ معلوماتی واقفیت کا تعلق ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور عارفانہ بصیرت کا تعلق گہری یافت سے۔ قرآن کے مطابق، حضرت لقمان نہ صرف دین کے مسائل اور احکام سے واقف تھے بلکہ وہ دین میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ وہ معرفت کے درجہ میں خدا کے دین کو پائے ہوئے تھے۔ وہ دین خداوندی کو اس کی گہرائیوں کے اعتبار سے جانتے تھے۔

حضرت لقمان کو جو حکمت عطا ہوئی تھی، اس سے انھوں نے جو سب سے پہلا سبق پایا وہ شکر خداوندی تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ لقمان کو ہم نے یہ حکمت دی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔

غیر حکیم آدمی چیزوں کو جیسا دیکھتا ہے ویسا ہی وہ ان کو مان لیتا ہے۔ اس لئے غیر حکیم آدمی کی نظر ہمیشہ چیزوں کے ظاہر پر اور ان کے سطحی پہلوؤں تک محدود رہتی ہے۔ اس کے برعکس حکیم آدمی چیزوں پر غور کرتا ہے۔ اس طرح وہ چیزوں کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے اندر کی حقیقت کے اعتبار سے جان لیتا ہے۔

مثلاً اپنی ذات کے اعتبار سے دیکھئے۔ آدمی ایک زندہ وجود کی حیثیت سے زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ غیر حکیم آدمی اپنے اس وجود کو دیکھے گا تو اس کے اندر فخر اور ناز کی کیفیت پیدا ہوگی۔ حتی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے گا۔ مگر حکیم کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔

حکیم آدمی اپنے وجود کو دیکھ کر یہ سوچے گا کہ میرا یہ وجود کہاں سے آگیا۔ میں خود تو اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر میں کیسے ایک مکمل انسان کی صورت میں دنیا میں موجود ہو گیا۔ یہ سوچ اس کو اس حقیقت تک پہنچائے گی کہ اس کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ یہ دریافت اس کو خدا کے آگے جھکا دے گی۔ وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تونے مجھے انسان بنا کر پیدا کیا۔ حالاں کہ میں خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح آدمی اپنے آپ کو ایک زمین پر پاتا ہے۔ یہ زمین ایک اتھاہ کائنات کے اندر ایک حیرت انگیز استثناء ہے۔ وسیع کائنات میں یہ واحد معلوم سیارہ ہے جہاں انسان زندہ رہے اور اپنے لئے تمدن

کی تعمیر کرے۔ اس زمین پر ضرورت کی ہر چیز انتہائی موزوں تناسب اور انتہائی صحیح مقدار میں موجود ہے۔ زمین اگر کائنات کے دوسرے اجسام، مثلاً چاند اور مریخ کی مانند ہو تو یہاں انسان کے لئے زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے۔

ایک غیر حکیم آدمی اس قیمتی دنیا کو صرف اس حیثیت سے جانے گا کہ وہ اس کے لئے ترقی کا شاندار میدان ہے۔ وہ دنیا کے مواقع کو استعمال کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کرے گا اور سمجھے گا کہ یہ سب میری محنتوں کا نتیجہ ہے۔ مگر حکیم آدمی اس سوچ میں پڑ جائے گا کہ اتنی قیمتی دنیا کیسے ظہور میں آئی۔ انسان خود تو اپنے لئے ایسی مفید اور موافق دنیا نہیں بنا سکتا۔ پھر کس نے اس کو بنایا۔

یہ حکیم آدمی کے سوچنے کا طریقہ ہے۔ اور جو آدمی اس طرح سوچے، اس کو اس کی سوچ خالق کی دریافت تک پہنچا دے گی۔ وہ اپنے خالق کو دریافت کر کے اس کا شکر ادا کرے گا۔ وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا، یہ تیرا کیسا عجیب احسان ہے کہ تو نے میرے لئے ایک ایسی دنیا بنائی جہاں میری ضرورت اور ترقی کا ہر سامان انتہائی کامل صورت میں موجود ہے۔

اسی طرح ہر معاملہ میں غیر حکیم کی نگاہ سطحی پہلوؤں میں اٹک کر رہ جاتی ہے، اس لئے وہ ان سے صحیح سبق نہیں لے پاتا۔ مگر حکیم آدمی چیزوں کی گہرائی میں جاتا ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ چیزوں کی گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ شکر و سپاس کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔

شکر سے غافل آدمی اپنی اُس جگہ پر نہیں پہنچتا جو اس کی حقیقی جگہ ہے۔ اس کے برعکس شکر کرنے والا آدمی اپنے اصل مقام کو پالیتا ہے۔ شکر کا مزاج آدمی کو اپنے رب کی پہچان بھی کرا دیتا ہے، اور اسی کے ساتھ خود اپنی پہچان بھی۔

" اور لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جب کہ وہ اس کو وعظ کہہ رہے تھے "—— یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے جو باتیں کہیں، وہ وعظ کے انداز میں کہیں۔ وعظ سے مراد یہ ہے کہ بھلائی کی تلقین ایسے اسلوب میں کی جائے جو دل کو نرم کرنے والا ہو (هو التذکیر بالخیر فیما یرق له القلب) مفردات امام راغب۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کو کسی نہ کسی طرح بس سنا دیا جائے۔ یہ صرف کہنا ہے، یہ وعظ و نصیحت نہیں ہے۔ وعظ اس کہنے کا نام ہے جس میں سنجیدگی ہو، دردمندی ہو، خیر خواہی ہو، نرم گفتاری

ہو ، دل کی تڑپ ہو ، اصلاح کا سچا جذبہ ہو، وغیرہ ۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے جو باتیں کہیں اس میں ان کا انداز صرف کہہ دینے کا نہیں تھا ، بلکہ انھوں نے جو کچھ کہا ، خالص وعظ و نصیحت کے انداز میں کہا۔ اس کے لئے انھوں نے از دل خیزد بر دل ریزد کا اسلوب اختیار کیا۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو پہلی نصیحت کی وہ یہ تھی کہ تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ شرک کی برائی تمام دوسری برائیوں کی جڑ ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کا واقعہ اصلاً دل کے اندر ہوتا ہے ۔اور پھر اس کی علامتیں اور اس کے مظاہر خارجی زندگی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ شرک بلاشبہ شکر خداوندی کی ضد ہے۔ ایک شخص جس کے اندر اپنے رب کے لئے شکر کی کیفیت پیدا ہو چکی ہو ، وہ کبھی اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا۔ شرک سب سے بڑی ناشکری ہے ۔

آدمی کمپیوٹر کی مانند نہیں ہے ۔ اس کے اندر شعور ہے ، اس کے اندر جذبات ہیں ۔ ان خصوصیات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اندر خوف اور محبت کے جذبات پاتا ہے ۔ اس کے اندر تعظیم اور تقدس کا احساس ابھرتا ہے ۔ اس قسم کے جذبات جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں ، ان کا مرکز اگر ایک خدا کو بنایا جائے تو یہی توحید ہے ۔ اور اگر ان جذبات کا مرکز خدا کے سوا کوئی اور چیز بن جائے تو اسی کا نام شرک ہے ۔ موحد کی زندگی کا رخ خدا کی طرف ہوتا ہے اور مشرک کی زندگی کا رخ غیر خدا کی طرف ۔

حضرت لقمان نے کہا کہ " شرک سب سے بڑا ظلم ہے "۔ ظلم کا مطلب ہے ـــــــ کسی چیز کو وہاں رکھنا جو اس کی جگہ نہ ہو (وضع الشئ فی غیر موضعہ) انسان کے اندر کسی کو بڑا ماننے ، کسی کو اپنا سب کچھ سمجھنے ، کسی سے امید اور خوف کرنے کے جو لطیف احساسات ہیں ، ان کو ایک خدا کے لئے وقف کیا جائے تو یہ گویا ان احساسات کو اپنے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا ۔ اور اگر ان احساسات کو کسی اور کے لئے وقف کیا جائے تو یہ گویا ان احساسات کو غلط مقام پر رکھنا ہوگا ، پہلا آدمی موحد ہے ، اور دوسرا آدمی مشرک۔

اللہ نے انسان کو اس کے والدین کے معاملہ میں حسن سلوک کی تاکید کی ہے ۔ اللہ کی شکر گزاری کے بعد انسان کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے ماں اور باپ کے حقوق ادا کرے ۔ ماں اور باپ کے حقوق میں بالقصد کوتاہی کسی حال میں جائز نہیں۔ خدا حقیقی معنوں میں انسان کا پالنے والا ہے ۔ اور ماں باپ مجازی معنوں میں انسان کی پرورش کرنے والے ۔

خدائی شریعتوں میں ماں باپ کی خدمت کو بہت ضروری بتایا گیا ہے ۔ حقوق کی ادائگی کے اعتبار سے

ان کا درجہ خدا کے بعد ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان، تم میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا حق ادا کرو۔ دونوں کو ایک ساتھ بیان فرمایا۔

اللہ کی حیثیت منعم حقیقی کی ہے۔ مگر اللہ کے بعد کسی انسان کے ساتھ سب سے زیادہ احسان کرنے والے اس کے والدین ہوتے ہیں۔ خاص طور پر آدمی کی ماں بچپن میں کئی سال تک اس کو پالنے اور پرورش کرنے کے لئے جو مصیبت اٹھاتی ہے، وہ کسی بھی آدمی کے سلوک سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے باپ اور خاص طور پر ماں کا حق آدمی کے اوپر بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کی طرف سے اگر آدمی کو شکایت پیدا ہو تب بھی ان کے حقوق میں کمی کرنے کی اجازت نہیں۔

اس عام حکم میں صرف ایک استثناء ہے، وہ یہ کہ اگر ماں باپ کا حکم خدا کے حکم سے ٹکرا جائے تو اس وقت خدا کے حکم کو لے لینا ہے اور ماں باپ کے حکم کو چھوڑ دینا ہے۔ تاہم اس انتہائی موقع پر بھی صرف متعین معاملہ کی حد تک ماں باپ کی خلاف ورزی کرنے کا حکم ہے۔ عام انسانی برتاؤ اور خدمت کے معاملہ میں بدستور ماں باپ کے ساتھ وہی بہتر سلوک کرنا ہے جس کے وہ ماں باپ ہونے کی حیثیت سے مستحق ہیں۔ دینی فرائض کے معاملہ میں ان کی حکم عدولی کی جا سکتی ہے مگر دنیوی تعلقات کے معاملہ میں ان کے ساتھ معروف طریقہ کے مطابق ہی برتاؤ کیا جائے گا۔

"اور پیروی صرف ان کے طریقہ کی کرو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ آخر کار سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تم کو آگاہ کر دوں گا جو کچھ تم دنیا میں کر رہے تھے" —— یہ پیروی کے سلسلہ میں نہایت اصولی بات ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا یا قوم کے لوگ جو کچھ کرتے ہیں، بس اسی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ آدمی جانچے اور پرکھے بغیر، جو کچھ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اسی کو خود بھی کرنے لگتا ہے۔ یہ گمراہی کا طریقہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ گمراہی کوئی سادہ گمراہی نہیں ہے۔ آخرت میں اس پر سخت پکڑ ہونے والی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی سمجھ کو استعمال کرے۔ وہ ان لوگوں کا پیرو بنے جو کسی دلیل پر ہیں۔ وہ ان کی پیروی نہ کرے جو عصبیت کی بنیاد پر ایک راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف بلاتے ہیں۔

آدمی کے سامنے ہمیشہ دو قسم کے نمونے ہوتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جو

اللہ کی طرف رخ کر کے اپنی زندگی کا سفر طے کر رہے ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جو اللہ سے منحرف ہوں۔ جو اللہ کی ہدایت سے بے پروا ہو کر خود ساختہ رخ پر چل رہے ہوں۔ پہلا گروہ حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پہلے گروہ کے راستے پر چلے، خواہ وہ اس کے غیر ہوں۔ وہ دوسرے گروہ کا نمونہ اختیار نہ کرے، خواہ وہ اس کے اپنے لوگ ہوں۔ خدا تقلید حق کو پسند کرتا ہے نہ کہ تقلید رجال کو۔

اس معاملہ میں حق پرستی کا طریقہ کوئی آسان طریقہ نہیں۔ آدمی جب خالص حق کو اپنا رہنما بناتا ہے تو اس کو لوگوں کی طرف سے بہت سی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم نے اپنے اکابر کے راستہ کو چھوڑ دیا۔ تم اپنی قوم کے مسلک سے دور ہو گئے۔ مگر آدمی کو اس قسم کی باتوں کی پروا نہیں کرنا چاہئے۔ آخرکار وہ وقت آنے والا ہے جبکہ خدا تمام حقیقتوں کو ظاہر کر دے۔ اس دن حق پرست لوگ سرخرو ہوں گے، اور باطل کلام بولنے والی تمام زبانیں بند ہو جائیں گی۔ اس دن نہ ان کے پاس الفاظ ہوں گے کہ وہ بولیں اور نہ کوئی سننے والا ہوگا جو ان کی بات کو سنے۔

"کوئی عمل اگر رائی کے دانہ کے برابر ہو اور وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں، پھر بھی اللہ اس کو حاضر کرے گا، اللہ باریک بیں ہے، خبردار ہے"۔

موجودہ دنیا میں آدمی مختلف حالات کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی وہ بظاہر ایک چھوٹا عمل کرتا ہے اور کبھی بڑا عمل۔ کبھی وہ چھپے ہوئے مقام پر ہوتا ہے اور کبھی کھلے ہوئے مقام پر۔ کبھی وہ دور ہوتا ہے اور کبھی قریب۔ اس بنا پر آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ خدا کو اتنے مختلف احوال کی خبر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ آدمی کی بھول ہے۔ خدا کا خدا ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ہر چھوٹے اور بڑے اور ہر کھلے اور چھپے عمل کو جانے۔ وہ ہر نوعیت کے عمل سے پوری طرح باخبر ہو۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر آن اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھے۔ وہ اس یقین کے ساتھ دنیا میں رہے کہ اللہ اس کو پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ احساس بیٹھ جائے، ان کی پوری زندگی احتیاط اور ذمہ داری کی زندگی بن جائے گی۔ وہ بولیں گے تو اس احساس کے ساتھ بولیں گے کہ خدا ان کی بات کو سن رہا ہے۔ اور کچھ کریں گے تو یہ سوچتے ہوئے کریں گے کہ خدا ان کو ہر جگہ اور ہر لمحہ دیکھ رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ نماز قائم کرو ــــــ آدمی کو جب اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ اللہ ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے اور آخرکار اس کا حساب لینے والا ہے،

تو فوراً اس کے اندر عبدیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے، وہ اللہ کے آگے اعتراف عجز کے طور پر گر پڑتا ہے۔ اسی کا نام نماز ہے۔ نماز کی حقیقت اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو چھوٹا کر لینا ہے۔ یہ کیفیت آدمی کے دل کے اندر پیدا ہوتی ہے اور نماز اس کیفیت کو خارجی صورت میں متشکل کرتی ہے۔

پھر فرمایا کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انھیں منکر سے روکو، اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ یہ بے شک ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

معروف سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو پسندیدہ اخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ کمزوروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ معاملات میں انصاف کا طریقہ اختیار کرنا، لوگوں کے درمیان بھائی اور خیر خواہ کی طرح رہنا۔ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو آدمی چاہتا ہے کہ خود اس کے ساتھ کیا جائے۔

منکر سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو اخلاقی اعتبار سے ناپسندیدہ سمجھی جائیں۔ مثلاً دوسروں کا حق ادا نہ کرنا۔ لوگوں کے ساتھ ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرنا، عہد پورا نہ کرنا، فخر و غرور یا کینہ و انتقام کی روش پر چلنا، غصب اور خیانت کو اپنے لئے جائز کر لینا۔ وغیرہ

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان اصول پسند انسان کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اسی اصول پسندی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اختیار نہیں کر پاتا۔ وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ کسی کو وہ غلط کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو ٹوکتا ہے اور اس کو صحیح کام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ حق پر عمل کرنے کے ساتھ حق کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ بھلائی اور برائی کے معاملہ میں غیر جانب دار بن کر رہ سکے۔

اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے صبر بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مختلف اسباب سے ایسا ہوتا ہے کہ ناصح کو اپنے مخاطب کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی اس کی روک ٹوک کی وجہ سے لوگوں میں غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ناصح ردعمل کا طریقہ اختیار کرے تو اس کے اور مخاطب کے درمیان نزاع کا ماحول قائم ہو جائے گا، اور نزاع کے ماحول میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

دعوت و اصلاح کا کام کوئی چیخ پکار کا کام نہیں۔ یہ بے حد سنجیدہ کام ہے۔ اس کو کرنے کے لئے آدمی کو عام اخلاقی سطح سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ اس کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو نفع و نقصان اور تعریف و تنقید اور موافقت و مخالفت سے بلند ہو کر کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

" اور لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا "

آدمی کو جب کوئی ایسی چیز مل جائے جس میں بظاہر وہ دوسروں سے زیادہ دکھائی دیتا ہو۔ مثلاً صحت، مال، عہدہ، طاقت، خاندانی شرف وغیرہ۔ تو ایسے موقع پر اس کے اندر فخر اور اکڑ کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ تکبر کا معاملہ کرنے لگتا ہے۔ ایسی روش بہت بڑا جرم ہے۔ وہ کسی حال میں اللہ کو پسند نہیں۔

آدمی کو کوئی چیز کم ملے یا زیادہ، دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہے۔ دونوں ہی امتحان کا پرچہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ساری توجہ اس پر لگائے کہ وہ اللہ کی آزمائش میں پورا اتر سکے، نہ یہ کہ کم ملے تو پست ہمت ہو جائے اور زیادہ ملے تو گھمنڈ اور برتری میں مبتلا ہو جائے۔ جو آدمی زیادہ پاکر فخر اور اکڑ میں مبتلا ہو جائے وہ بندوں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش میں خدا کی نظر میں اپنے کو چھوٹا اور حقیر بنا لیتا ہے۔ اور جو آدمی خدا کی نظر میں حقیر ہو جائے اس کو پھر کوئی بڑائی ملنے والی نہیں۔

" اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے "

" اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر " یہاں ظاہری کیفیت کا لفظ بول کر باطنی کیفیت کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ آدمی کو جب کوئی چیز مل جائے۔ مثلاً صحت، طاقت، دولت، عہدہ، اقتدار، وغیرہ تو اس کے مزاج میں بڑائی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر اس کی چال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ظاہری چیزوں میں اس کو کم حصہ ملے، وہ کسی نقصان سے دوچار ہو جائے تو اس کی چال میں پست ہمتی اور احساس کمتری کا انداز دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں غلط ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اعتدال پر قائم رہے۔ اس کو کچھ ملے تو وہ فخر والی چال نہ چلے، اور اگر اس سے کچھ کھو جائے تو وہ مایوسی کی چال نہ اختیار کرے۔

اسی طرح انسان کو گدھے کی مانند نہیں ہونا چاہئے۔ گدھا صرف ایک قسم کی آواز نکال سکتا ہے۔ وہ جب بھی بولے گا، کرخت اور بھدی آواز ہی بولے گا۔ لیکن انسان دونوں قسم کی آواز اپنے منھ سے نکالنے پر قادر ہے۔ سخت آواز بھی اور نرم آواز بھی۔ اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے تاکہ وہ اس کو آزمائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انسان کو یہ خصوصی کریڈٹ دینا چاہتا ہے کہ اس نے خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت کڑی آواز کا طریقہ چھوڑ دیا۔ اور صرف نرم آواز اپنے منھ سے نکالی۔ جو لوگ اپنے ملے ہوئے اختیار کا اس طرح صحیح استعمال کریں وہ اللہ کے یہاں بہت بڑا انعام پائیں گے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں حضرت لقمان کا حوالہ جس طرح دیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک، لقمان کی حیثیت ایک مثالی باپ کی ہے۔ ایک باپ کے جذبات اپنے بیٹے کے بارہ میں کیا ہونے چاہئیں، اس کا بہترین نمونہ حضرت لقمان کی زندگی میں ملتا ہے۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے سے نہ ذاتی حقوق کی کوئی بات کہتے اور نہ مادی یا دنیوی مفاد کے بارہ میں اس کو کوئی مشورہ دیتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، تمام تر حق وصداقت کے بارہ میں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے ناصحانہ انداز میں کلام کرتے ہوئے اس کو توحید کی وصیت کی۔ انھوں نے اس کو اللہ کے سامنے جواب دہی کی یاد دلائی۔ انھوں نے اس کو اللہ کی عبادت اور عمل خیر کی تلقین کی۔ انھوں نے اس کو تاکید کی کہ دین کی راہ میں خواہ مشکلات ومصائب پیش آئیں، تم کو ہر حال میں صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنا چاہئے۔ کسی حال میں اس سے ہٹنا نہیں چاہئے۔

پھر حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو تاکید کی کہ لوگوں کے درمیان وہ اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔ وہ تواضع اور اعتدال کی روش اختیار کرے۔ اس کی روح میں عبدیت اس طرح شامل ہو جائے کہ اس کا اثر اس کے جسم پر اور اس کے اعضاء وجوارح پر ظاہر ہونے لگے۔ وہ دنیا میں انسان بن کر رہے، وہ گدھے کی مانند نہ ہو جائے۔

"گدھے کی طرح نہ بولو، کیوں کہ گدھے کی آواز سب سے بری آواز ہے" —— حضرت لقمان کے اس قول میں بظاہر صرف گدھے کی آواز کا ذکر ہے۔ مگر آواز کا لفظ یہاں حصر کے طور پر نہیں بلکہ علامت کے طور پر ہے۔ اس کا پورا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا میں انسان بن کر رہو، تم گدھے بن کر نہ رہو۔ تم کو اوصاف انسانی کا پیکر ہونا چاہئے نہ کہ اوصاف حیوانی کا پیکر۔

بیٹا کسی آدمی کے لئے اللہ کی ایک نعمت ہے۔ بلکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ کوئی شخص خود سے اپنے لئے ایک بیٹا پیدا نہیں کرسکتا۔ یہ صرف اللہ ہے جو کسی کو بیٹا جیسی قیمتی چیز عنایت فرماتا ہے۔ کارخانۂ قدرت کے سوا کہیں اور سے ایک بیٹے کی تخلیق ممکن نہیں۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ جب اس کو اولاد ملے تو اس کو تمام تر اللہ کا عطیہ سمجھے۔ اس عطیہ کی شکرگزاری میں وہ ہمہ تن اللہ کا فرماں بردار بندہ بن جائے اور اپنی اولاد کے لئے بھی یہی چاہے کہ وہ اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں زندگی گزارے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ایسا باپ بنے جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ہو کہ اس کا بیٹا صحیح معنوں میں اللہ والا بن کر دنیا میں رہے، وہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ وہ پوری طرح اللہ کا عبادت گزار بن جائے۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ ہو۔ وہ تمام بڑوں کے ساتھ اپنے بھائی جیسا سلوک کرے اور تمام چھوٹوں سے وہ معاملہ کرے جو وہ اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے۔

اللہ سے تعلق جب صحیح معنوں میں پیدا ہوتا ہے تو وہ آدمی سے اس کی انا کو چھین لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگتا ہے۔ لوگ اس کو تکلیف پہنچائیں تب بھی وہ لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ لوگوں کے منفی رویہ کے باوجود وہ ان کے ساتھ مثبت رویہ کے اصول پر قائم رہتا ہے۔

ایسا آدمی ہر معاملہ میں اللہ کی پسند کو اپنا رہنما بنا لیتا ہے نہ کہ ذاتی پسند کو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصول کے تحت معاملہ کرتا ہے نہ کہ اپنے نفس سے اٹھنے والی خواہشوں کے تحت۔

رہنمائے حیات

جنوری ۱۹۹۲ کا الرسالہ انشاء اللہ خصوصی نمبر ہوگا۔ اس کا نام "رہنمائے حیات" ہوگا۔ اس میں زندگی کی تعمیری رہنمائی سے متعلق باتیں درج ہوں گی۔ اصحاب ایجنسی مزید مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

مسئلہ کا حل

ستمبر ۱۹۸۹ میں میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس سفر کے دوران میری ملاقات ایک شیعہ بزرگ محمد عباس کاظمی سے ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب میں وہ لاہور چلے گئے اب وہ ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے لاہور میں رہتے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے برصغیر ہند کا ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور ۱۹۴۷ کے بعد کا بھی۔ یہ بتائیے کہ دونوں زمانوں میں آپ نے کیا فرق پایا۔ انھوں نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا ـــــ بس یہ فرق ہے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے، اب پاکستان میں شیعہ اور سنی کے درمیان وہی جھگڑے ہو رہے ہیں (الرسالہ مارچ ۱۹۹۰، صفحہ ۳۲ - ۳۳)

اسی نوعیت کا ایک شیعہ سنی جھگڑا کراچی میں ۱۴ جولائی ۱۹۹۱ کو ہوا۔ شیعہ فرقہ کا ایک جلوس سنیوں کی مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر سنیوں کو اعتراض ہوا۔ انھوں نے مطالبہ کیا



Policemen in Karachi wielding lathis against Sunni Muslims who tried to block a procession by Shia Muslims outside the Karachi Mosque on Sunday. — AP/PTI

کہ جلوس کی روٹ بدل جائے۔ شیعہ لوگ روٹ بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی جس میں پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ مقابل کی تصویر (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جولائی ۱۹۹۱) میں پولیس سنی فرقہ کے لوگوں پر لاٹھی چارج کر رہی ہے جو شیعہ جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پاکستان اس لئے بنوایا گیا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے لیڈروں نے کہا کہ ہمیں ایک خطہ چاہئے جہاں سب مسلمان ہوں۔ تاکہ وہاں جھگڑے نہ ہوں اور ہم امن و سکون کے ساتھ رہ سکیں۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ مسلم لینڈ میں بھی وہی تمام جھگڑے جاری ہیں جو صرف ہندو لینڈ کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ جھگڑے کا تعلق ہندو لینڈ اور مسلم لینڈ سے نہیں۔ جھگڑے کا تعلق جھگڑا کرنے والوں کے مزاج سے ہے۔ اگر لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج ہو تو کہیں جھگڑا نہیں ہوگا۔ اور اگر تحمل کا مزاج نہ ہو تو ہر جگہ جھگڑا ہوگا، خواہ وہ کوئی بھی جگہ کیوں نہ ہو۔

زندگی خلاف مزاج باتوں کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اس برداشت کے بغیر کہیں بھی امن و سکون کا ماحول نہیں بن سکتا۔ خاندان کے اندر بھی اس کی ضرورت ہے۔ بستی کے اندر بھی اور پورے ملک کے اندر بھی۔ ایک فرقہ کے سماج میں بھی اسی سے امن قائم ہو سکتا ہے اور کئی فرقہ کے سماج میں بھی۔

جہاں بھی کچھ انسان مل کر رہیں، خواہ وہ ایک مذہب اور کلچر کے ہوں یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ وہاں لازماً ایک دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کے مواقع پیدا ہوں گے۔ ان مواقع کی پیدائش کو بند نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان کو نقصان کی حد تک جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ٹکراؤ کی نوبت آئے تو اس کو حسن تدبیر سے دفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اعراض اور صبر کے ذریعہ اس کو اس کے ابتدائی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔ اس کے سوا جو بھی صورتیں ہیں وہ سب مسئلہ کو بڑھانے کی صورتیں ہیں نہ کہ مسئلہ کو گھٹانے کی صورتیں۔

جو چیز غیر فطری ہو اس کو آپ کوشش کرکے ختم کر سکتے ہیں۔ مگر ایک فطری چیز کو ختم کرنا

کسی حال میں ممکن نہیں۔ سماج کے اندر مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے، اس لئے اس کو کسی بھی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ اس کو انگیز کیا جائے۔ اعراض اور صبر کی تدبیروں سے اس کو اپنے لئے بے ضرر بنا دیا جائے۔

تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے دور میں جلوس پر جھگڑے کا ایک واقعہ بمبئی میں ہوا۔ ہندوؤں کا ایک جلوس باجا بجاتا ہوا ایک مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر مسجد کے مسلمان متولی نے اعتراض کیا۔ بات بڑھی۔ یہاں تک کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ متولی نے انگریز عدالت کے سامنے اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ ہندوؤں کو اس کی مسجد کے سامنے سے جلوس نکالنے سے روک دیا جائے۔ مقدمہ چلا۔ بمبئی کے ایک مشہور مسلم رہنما نے اس کیس کی وکالت کی۔ ان کی وکالت کامیاب رہی۔ انگریز جج نے یہ فیصلہ دیا کہ مذکورہ مسجد کے سامنے عدالتی حکم کے تحت یہ بورڈ لگا دیا جائے کہ اس کے سامنے ہندوؤں کو جلوس نکالنے کی اجازت نہیں۔

مذکورہ مسلم رہنما اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان خوب مقبول ہوئے۔ ان کو مسلمان اپنا عظیم رہنما اور مسلم ملت کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ مگر یہ صرف نا سمجھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قیادت نہیں تھی۔ بلکہ برعکس رہنمائی تھی۔ مذکورہ رہنما اگر دانش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ جلوس کے مسئلہ کا حل اس کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو برداشت کرنا ہے۔ اس قسم کی چیزیں ہر سماج میں جاری رہیں گی۔ حتیٰ کہ خالص مسلم سماج میں بھی۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے نہ کہ بے فائدہ طور پر ان سے الجھا جائے۔

ایک بچہ نے پھول توڑا۔ اس کا ہاتھ کانٹے سے زخمی ہوگیا۔ وہ روتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا۔ اب یہ باپ کی نادانی ہوگی اگر وہ پھول کے درخت سے کانٹے کا وجود ختم کرنے کی مہم چلائے۔ اس کے برعکس اس کو چاہئے کہ خود اپنے بیٹے سے کہے کہ اس دنیا میں ہر پھول کے ساتھ کانٹا موجود رہے گا۔ اس لئے تم کانٹے کے ساتھ جینا سیکھو نہ یہ کہ کانٹے کا وجود مٹانے کی بے فائدہ کوشش کرو۔

بمبئی کے واقعہ میں مسلم قیادت اگر مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دیتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سو سال سے جلوس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں، ہندستان میں بھی اور اسی طرح پاکستان میں بھی۔ تعمیر کے بہترین امکانات کے درمیان وہ بے تعمیر حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

الفاظ ختم نہیں ہوتے

غالباً ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ میں لکھنؤ میں حضرت گنج کے پاس سڑک پر جا رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر تھا۔ قریب ہی ایک آدمی سڑک کے کنارے بائیں طرف چل رہا تھا۔ اتنے میں ایک موڑ آیا۔ آدمی موڑ پر تھا کہ عین اسی وقت پیچھے سے ایک سائیکل آگئی۔ ایک نوجوان تیزی سے سائیکل دوڑاتا ہوا موڑ پر پہنچا۔ سائیکل قابو میں نہ آسکی اور راہ گیر سے ٹکرا گئی۔ راہ گیر سڑک پر گر گیا۔ سائیکل بھی رک گئی۔ راہ گیر اٹھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد راہ گیر اور نوجوان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی :

گھنٹی کیوں نہیں بجائی ——— راہ گیر نے کہا۔

گھنٹی نہ ہو تو ——— نوجوان نے جواب دیا۔

بریک کیوں نہیں لگایا۔

بریک نہ ہو تو۔

جب تمہارے پاس گھنٹی نہیں، بریک نہیں، تو تم سائیکل تیز کیوں دوڑاتے ہو

کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر چپ ہونا نہ چاہے تو کسی بھی دلیل سے اس کو چپ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ بولتا رہے گا۔ یہاں تک کہ آپ خود ہی چپ ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلیل کو ماننے کے لئے سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ غیر سنجیدہ آدمی کو کسی بھی دلیل سے قائل کرنا ممکن نہیں۔

موجودہ دنیا فتنہ کی دنیا ہے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا فتنہ الفاظ ہیں۔ اس دنیا میں آدمی ہر بات کے جواب میں الفاظ پالیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب تک سنجیدہ نہ ہو اس کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔

مثلاً آپ ایک آدمی سے کہیں کہ ٹیپو سلطان کی فوج نے آخر وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف تھوڑے سے آدمی ٹیپو کے ساتھ رہ گئے تھے۔ دوسری طرف انگریز جنرل کے پاس بہت بڑی فوج

تھی۔ ایسی حالت میں جنگ واضح طور پر ہلاکت کے ہم معنی تھی۔ اس کے باوجود ٹیپو نے جنگ کی اور مارے گئے۔ مگر یہ طریقہ صحیح نہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا۔ مگر آپ کی قوم بنی اسرائیل آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے ساتھ رہ گئے۔ اس وقت جہاد کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دشمن کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو جنگ نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو سن کر وہ آدمی کہے گا کہ آپ موسیٰ اور ٹیپو کا تقابل کر رہے ہیں۔ موسیٰ تو پیغمبر تھے، پھر پیغمبر کا اور ایک عام انسان کا تقابل کیسے کیا جا سکتا ہے۔

آپ جواب دیں گے کہ بھائی، میں نے تقابل کی بات نہیں کہی۔ میں نے پیروی کی بات کہی ہے۔ پیغمبر ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ موسیٰ بھی ہمارے لئے نمونہ تھے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ جب کسی معاملہ میں پیغمبر کا نمونہ مل جائے تو ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم اس کے خلاف نہ جائیں۔ اب وہ آدمی پرجوش طور پر کہے گا۔ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں۔ ہم تو پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ ہمیں اپنے پیغمبر کی پیروی کرنی ہے نہ کہ موسیٰ کی۔ کیا آپ نے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں پڑھا کہ لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی۔

آپ جواب دیں گے کہ میرے بھائی، یہی اسوہ ہمارے رسول کا بھی ہے۔ مکہ میں آپ کے ساتھ تھوڑے لوگ تھے۔ اس وقت آپ نے مکہ والوں سے جنگ نہیں کی۔ انھوں نے تلواریں لے کر آپ کا مکان گھیر لیا۔ تو آپ رات کے وقت خاموشی سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ آپ نے اس وقت جنگ کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اب وہ آدمی کہے گا کہ آپ نے اسلامی تاریخ نہیں پڑھی۔ آپ حضرت ابو بکر کی تاریخ دیکھئے۔ ان کی خلافت کے زمانہ میں جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک رسی بھی اگر کوئی شخص دینے سے روکے گا تو میں اس سے جہاد کروں گا۔

اب آپ کہیں گے کہ بھائی، تم اقتدار کے زمانہ کی بات کر رہے ہو، اور میں اقتدار سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں یہ بتا رہا ہوں کہ جب مسلمان اقتدار کی حالت میں نہ ہوں، اس وقت ان کے لئے اسلام میں کیا نمونہ ہے۔ آدمی یہ سن کر پرجوش طور پر کہے گا کہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ اسلام تو ایک مکمل نظام ہے۔ خدا نے اسلام کی صورت میں اپنی مکمل شریعت بھیج دی ہے۔ اسلام میں آدھے پونے کی تقسیم نہیں۔ اسلام ایک کامل نظام ہے اور کامل نظام کے طور پر ہی اس کو

لیا جا سکتا ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ میرے بھائی، یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ مگر کوئی بھی نظام پورا کا پورا ایک وقت قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر کام آغاز سے چل کر اختتام تک پہنچتا ہے۔ اسی کا نام تدریج ہے۔ اسلام کا کام بھی تدریجی انداز سے ہوگا۔ ہمیں یہ کرنا ہے کہ آج کے حالات میں جو کچھ ممکن ہے وہاں سے اپنے عمل کا آغاز کریں۔ اس طرح ہمارا اسلامی سفر شروع ہو جائے گا۔ وہ منزل بہ منزل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ان شاء اللہ ہم آخری مرحلہ تک پہنچ جائیں گے۔ اب آپ کا مخاطب اور زیادہ پر جوش ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ آپ تو مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مجاہدانہ عزائم کو ختم کر دیں اور نظام باطل کی دی ہوئی رعایتوں کے تحت کمتر زندگی پر راضی ہو جائیں۔

اسی طرح وہ آدمی آپ کی ہر دلیل کو پر جوش طور پر رد کرتا رہے گا۔ آپ خواہ کتنی ہی مدلل بات کہیں وہ آپ کی ہر بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ الفاظ بول دے گا۔ اس طرح گفتگو کبھی ختم نہ ہوگی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا خاص سبب نکتہ بحث کو بدلنا ہے۔ آپ جب ایک دلیل پیش کرتے ہیں تو اس کا تعلق کسی خاص نکتہ بحث سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مخاطب نکتہ بحث کو بدل دے تو آپ کی دلیل، نئے نکتہ بحث کے اعتبار سے بے وزن معلوم ہونے لگے گی۔

قرآن میں حضرت ابراہیم نے شاہ نمرود کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ پھر تو میں بھی رب ہوں، کیوں کہ مجھے بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہوں زندگی دوں اور جس کو چاہوں مروا دوں۔ نمرود نے یہاں یہی کیا کہ اس نے نکتہ بحث کو بدل دیا۔ حضرت ابراہیم نے برتر اختیار کے معنی میں یحیی ویمیت کہا تھا، نمرود نے اس کو ملکی اختیار کے معنی میں لے کر کہہ دیا کہ انا احیی وامیت (البقرہ ۲۵۸)

حضرت ابراہیم نے داعیانہ حکمت کے تحت اس کو نظر انداز کیا اور فرمایا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اس کو مغرب سے نکال دو۔ یہ سن کر نمرود مبہوت ہو گیا۔ آجکل کے انسانوں کے برعکس، شاید نمرود کے اندر بھی کچھ حیا تھی۔ ورنہ وہ چاہتا تو دوبارہ نکتہ بحث کو بدل کر یہ کہہ سکتا تھا کہ ابھی تم موت وحیات کی بات کر رہے تھے اور پھر اچانک تم سورج چاند کی بات کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو خود اپنی بات پر یقین نہیں۔

سمتِ سفر

ایک عربی پرچہ (صوت الامۃ، فروری ۱۹۹۱) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان جذباتی طور پر یہ تھا: افیقوا من النوم ایھا المسلمون (اے مسلمانو، نیند سے جاگو) اس کو پڑھ کر مجھے ایک عربی شاعر کی نظم یاد آگئی۔ اس نے طنزیہ انداز میں عربوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نظم کا ایک شعر یہ تھا کہ اے عربو، تم سو جاؤ اور بیدار نہ ہو۔ کیوں کہ سونے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں:

نَامُوا وَلَا تَسْتَيْقِظُوا لَا فَازَ إِلَّا النُّوَّمُ

عربوں سے (یا مسلمانوں سے) یہ شکایت میرے نزدیک خلافِ واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عرب اور دوسرے مسلمان خوب جاگے۔ انھوں نے بڑی بڑی سرگرمیاں دکھائیں۔ البتہ ان سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ نتیجہ کے فقدان کو لوگ عمل کے فقدان پر محمول کرکے ان سے شکایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر فلسطین کے مسئلہ کو لیجئے جس کے نام پر خلیج کی جنگ لڑی گئی۔ شیخ حسن البنانے ۱۹۴۸ میں اس کے لیے بڑے پیمانہ پر جہاد کیا۔ الاخوان المسلمون اپنی تاسیس کے وقت سے لے کر اب تک نہایت بلند بانگ طور پر فلسطین کے مسئلہ پر سرگرم رہے ہیں۔ خود فلسطینی لوگ فلسطین کے اندر اور اس کے باہر پرشور طور پر جاگے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح ساری دنیا کے مسلمان بھی۔ جمال عبدالناصر نے اسی سوال پر ۱۹۶۷ میں اسرائیل اور فرانس اور برطانیہ سے جنگ کی۔ خلیج کی جنگ ۱۹۹۱ بھی فلسطین کے نام پر تھی۔ حتی کہ بہت سے مسلمانوں نے صدام حسین کے روپ میں صلاح الدین ایوبی کو دوبارہ پیدا کر لیا۔ مگر ساری کوششوں کے باوجود نتیجہ بالکل الٹا نکل رہا ہے۔ اس مدت میں اسرائیل کا رقبہ کئی گنا بڑھ گیا اور اس کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اور فلسطینیوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ سو رہے ہیں، انھیں جگایا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ بے فائدہ سمتوں میں دوڑ رہے ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کو غلط سمت سے موڑ کر صحیح سمت میں سرگرم سفر کیا جائے۔ مسئلہ غلط رُخ پر عمل کرنا ہے نہ کہ سرے سے عمل نہ کرنا۔

عمل کی صحیح سمت وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو، جو عمل نتیجہ خیز نہ ہو وہ صحیح عمل بھی نہیں۔ اس دنیا میں نتیجہ صحیح سمت میں عمل کرنے سے ملتا ہے نہ کہ مجرد عمل کرنے سے۔

توازن ، تدریج

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "توازن" قومی ترقی کے لئے شاہ کلید ہے۔ یعنی متوازن عمل کے ذریعہ ہی ہم قومی ترقی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ قومی ترقی کے عمل کے لئے کلیدی لفظ تدریج ہے۔ نہ کہ توازن۔

توازن بھی ایک اصول ہے اور تدریج بھی ایک اصول۔ مگر ہر ایک کا مقام استعمال الگ ہے۔ شاعر کی زبان میں ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر نکتہ کا ایک مقام :

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

جو لوگ قومی ترقی کے عمل میں توازن کو شاہ کلید بتاتے ہیں وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اصرار کر رہے ہیں کہ ہم کو ہر محاذ پر بیک وقت ہمہ جہتی عمل کرنا ہوگا۔ ذہنی بیداری اور تعلیم جیسے کاموں کے ساتھ عین اسی وقت سیاسی عمل اور حقوق طلبی کی مہم بھی پوری طاقت کے ساتھ جاری کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم زندگی کی دوڑ میں ناقابل عبور حد تک پیچھے ہو جائیں گے۔

حتی کہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ "اگر کوئی قوم صرف تعلیم یا اقتصادیات کے محاذ کو لے کر بیٹھ جائے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور ریاست میں دوسروں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش نہ کرے تو وہ حقوق سے تو محروم ہی رہے گی، خود تعلیم اور اقتصادیات کو حاصل کرنے کے مواقع بھی اس کو نہیں مل سکتے"۔

اس قسم کے مضامین یہ مان کر لکھے جاتے ہیں کہ ابھی تک ہم کو قومی اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ ان کو حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ قسم کے قائدین اور دانشوروں کی اپنی اولاد تعلیمی اور اقتصادی میدان میں اعلیٰ ترقیات حاصل کر رہی ہیں۔ اور وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ملت کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے تو ضروری ہے کہ پہلے سیاسی حقوق کی منزل طے کی جائے مگر خود ان حضرات کی اپنی اولادیں اس منزل کے طے ہونے سے پہلے ہی تمام ترقیاں حاصل کر رہی ہیں۔

اس قسم کی باتیں کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے بیٹوں کو سمندر پار کے

ملکوں میں تعلیم و ترقی کے لئے بھیج رکھا ہے یا ان کو ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ہوسٹلوں میں داخل کر رکھا ہے جہاں وہ ملی سیاست کے ماحول سے الگ رہ کر تعلیمی ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ وہ انھیں قومی حقوق کی سیاست سے پوری طرح دور رکھتے ہیں۔ اپنے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز وہ سیاست سے علیحدگی میں سمجھتے ہیں۔ اور قوم کے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز سیاست کے طوفان میں غوطہ خوری میں۔

ان حضرات کی یہ دہرا پالیسی بتاتی ہے کہ یا تو انھیں اپنی بات پر یقین نہیں، یا ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اور قوم کے بیٹوں کے معاملہ میں غیر سنجیدہ۔

اب توازن اور تدریج کے معاملہ کو ایک اصولی مثال کے ذریعہ سمجھئے۔ ایک شخص دو ہزار روپیہ مہینہ کماتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے کہ اس میں سے ایک ہزار روپیہ تفریحی مدوں میں خرچ کر دے تو اس سے کہا جائے گا کہ توازن کے ساتھ خرچ کرو۔ یعنی اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنا بجٹ بناؤ۔ جو مد زیادہ اہم ہے اس میں زیادہ رقم لگاؤ اور جو مد کم اہم ہے اس میں کم رقم خرچ کرو۔ آمد اور خرچ میں ہم آہنگی قائم کرنے کا مسئلہ ہو تو اس کے لئے کلیدی لفظ توازن ہوگا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ایک شخص کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر توازن کے اصول کو منطبق کرتے ہوئے باپ ایسا کرے کہ جس طرح وہ بچہ کی غذا اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے اسی طرح وہ اول روز سے اس کے کان میں سیاست کے اسباق بھی داخل کرنا شروع کر دے۔ وہ اس کو جنس کے رموز سمجھانے کے لئے بھی ایک معلم مقرر کر دے۔ اگر کوئی باپ اس طرح اپنے بچہ کی متوازن تربیت شروع کر دے تو یہ بلاشبہ ایک لغو فعل ہوگا۔ کیوں کہ یہ زندگی کا معاملہ ہے۔ اور زندگی کا ارتقاء ہمیشہ تدریج کے اصول پر ہوتا ہے نہ کہ توازن کے اصول پر۔

توازن بجائے خود ایک اعلیٰ اصول ہے۔ مگر زندگی کی تعمیر کے معاملہ میں کلیدی لفظ توازن نہیں ہے بلکہ تدریج ہے۔ تدریج کے اصول پر عمل کرکے ہی ہم ترقی کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ توازن کے اصول پر عمل کرنے کی صورت میں ہم کہیں نہیں پہنچیں گے۔ خود ہماری قریبی تاریخ میں اس کی واضح مثال موجود ہے۔

اورنگ زیب (۱۶۱۸-۱۷۰۷) سے لے کر اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمان سترھویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک پورے تین سو سال سے

سیاست کے محاذ پر مسلسل زور آزمائی کر رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں ایک دن کے لئے بھی انھوں نے یہ "غیر متوازن" طریقہ اختیار نہیں کیا کہ اپنی ساری طاقت صرف ذہنی بیداری کے محاذ پر لگا دیں اور سیاست کے عملی محاذ کو خالی چھوڑ دیں۔ اس تین سو سالہ متوازن عمل کے باوجود ملت کی بربادی میں صرف اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ملت کا احیاء اب تک کسی بھی درجہ میں واقعہ نہ بن سکا۔ کیا یہ تجربہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں مکمل طور پر تدریجی انداز میں عمل فرمایا۔ چنانچہ ابتدائی ۱۳ سال تک آپ پوری طرح سیاست اور جہاد کے میدان سے دور رہے۔ اس مدت میں آپ کی ساری کوشش اس امر پر مرتکز رہی کہ آپ لوگوں کے اندر ایمان کی اسپرٹ مکمل طور پر بیدار کر دیں۔ گویا نصف سے زیادہ مدت میں آپ نے عملی سیاست سے "صبر" کا طریقہ اختیار فرمایا نہ کہ اس میں داخل ہونے کا۔

موجودہ زمانہ میں جاپان اس طریق کار کی ایک مثال ہے۔ ۱۹۴۵ کے بعد اس نے قومی حقوق کی سیاست کو یکسر ترک کر دیا اور صرف سائنسی تعلیم اور ٹکنکل ریسرچ کے میدان میں اپنی ساری توجہ لگا دی۔ حالات بتاتے ہیں کہ جاپان نے ۳۰ سالہ "غیر متوازن" محنت سے وہ کامیابی حاصل کر لی جو مسلمان ۳۰۰ سالہ "متوازن" محنت کے بعد بھی حاصل نہ کر سکے۔

ہندستان میں عیسائی فرقہ عملی سیاست سے بالکل الگ رہتا ہے۔ مگر تعلیم کے میدان میں وہ تمام فرقوں سے آگے ہے۔ مسلمان تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد مسلسل سیاست کے ہنگاموں میں مشغول رہے۔ اس کے باوجود، ایجوکیشن منسٹری کی رپورٹ کے مطابق، مسلمان سب سے زیادہ تعلیمی پسماندگی میں مبتلا ہیں۔ حتی کہ تعلیم کے میدان میں وہ ہریجنوں سے بھی زیادہ پیچھے جا چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں صحیح طریقہ تدریج کا ہے نہ کہ توازن کا۔ تجربہ اور اصول دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ساری قوت ابتدائی تعمیر کے محاذ پر لگا دی جائے۔ اس وقت ہم تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ اور جو لوگ تاریخ کے آغاز میں ہوں ان کے لئے عمل کا اصول صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو الاقدم فالاقدم کہا گیا ہے۔ اس کا دوسرا نام تدریج ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں بہت عرصہ سے الرسالہ مشن سے وابستہ ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ الرسالہ سے اختلاف کرنے والوں کے پاس الرسالہ کے خلاف کوئی ٹھوس بات نہیں۔ البتہ الرسالہ کی برداشت کی پالیسی پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں برداشت ہی کو بہترین حل کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہے۔ مگر ملت کے مسائل کا معاملہ ہو تو وہ برداشت کی پالیسی کو بزدلی کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ آخر ذاتی پالیسی اور ملی پالیسی میں اس تضاد کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ذاتی معاملہ میں سنجیدہ ہیں مگر ملت کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں۔ اسی سے یہ فرق پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ذاتی مسئلہ سامنے آتا ہے تو ان کی توجہ مسئلہ کے حل کی طرف چلی جاتی ہے۔ اور جب ملت (مسلمان بمقابلہ ہندو) کا مسئلہ ہو تو وہ فوراً جذباتی ہو جاتے ہیں اور اپنے اور غیر کے مزاج کے تحت سوچنے لگتے ہیں۔ ذاتی معاملہ میں سنجیدہ سوچ ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر ملت کا معاملہ ہو تو اپنی برتری کا احساس ان کا رہنما بن جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں ان کا مقصود مسئلہ کو حل کرنا ہوتا ہے اور ملت کے معاملہ میں صرف اپنے وقار کو بچانا یا اپنی برتری کو قائم کرنا۔ مسلمان اگر ایسا کریں کہ جس طرح ذاتی معاملہ میں وہ مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں اسی طرح ملت (ہندو مسلم مسئلہ) کے معاملہ میں بھی وہ عملی حل کو اہمیت دینے لگیں تو اس کے بعد ان کی دو عملی یکسر ختم ہو جائے گی۔

میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ وہ چیز جس کو صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے وہ عقیدۂ توحید کی دین ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ دنیا کو ملا۔ صنعتی انقلاب فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہے۔ شرک کے عقیدہ کے تحت انسان فطرت کو مقدس سمجھ کر اس کا پرستار بنا ہوا تھا۔ توحید نے فطرت کو پرستاری کے مقام سے ہٹا دیا، اس کے بعد ہی فطرت کو مسخر کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جو آخر کار جدید صنعتی انقلاب تک پہنچا۔ اس کے بارہ میں ایک صاحب نے فرمایا کہ توحید کا عقیدہ تو تمام پیغمبروں نے پیش کیا تھا، پھر صنعتی انقلاب پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں کیوں نہیں آیا، وہ بعد کو کیوں آیا۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا عقیدہ صرف فکری تحریک کے مرحلہ میں تھا، وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔ پیغمبر اسلام اور آپ

کے اصحاب نے توحید کو فکری دور سے نکال کر عالمی انقلاب کے دور میں پہنچا دیا۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی فکر اسی وقت عمومی تبدیلی لا سکتا ہے جب کہ وہ نظریہ نہ رہے بلکہ انقلاب بن جائے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت مسلم دنیا میں بہت سی اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں آپ اپنے اور ان کے درمیان کیا فرق سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان مختلف تحریکوں کو وسیع تقسیم (broad division) میں دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اسلام کو دعوت و تبلیغ کے مشن کے طور پر لے کر اٹھی ہیں۔ دوسری وہ جو سیاسی انقلاب کے مقصد کے تحت کام کر رہی ہیں۔ ایک کا نشانہ اگر "دعوتی اسلام" ہے۔ تو دوسرے کا نشانہ "سیاسی اسلام"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہی تحریک صحیح اسلامی تحریک ہے جو "دعوتی اسلام" کے لئے اٹھے۔ "سیاسی اسلام" کو لے کر اٹھنے والوں کا کیس صراط مستقیم سے انحراف (deviation) کا کیس ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اتباع سبل ہے نہ کہ اتباع صراط۔

یہ اس معاملہ کا نظری پہلو ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ دعوتی اسلام کی موجودہ تحریک زیادہ تر "فضائل" کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہے، جب کہ سیاسی یا انقلابی اسلام کی تحریک "دلائل" کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دعوتی اسلام کے مشن کی صحت کے باوجود امت کا انٹلکچول طبقہ (intellectual class) ابھی تک اس سے جڑ نہ سکا۔

یہ طبقہ جس کو خواص کا طبقہ کہا جا سکتا ہے، وہ اپنی ذہنی ساخت کی وجہ سے بات کو دلائل کے اسلوب میں سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر دعوتی اسلام کے حاملین کا موجودہ انداز خطاب ان کے دلائل پسند مزاج کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ اسی بنا پر آج یہ صورت حال ہے کہ امت کے طبقۂ خواص کا بیشتر حصہ سیاسی اسلام سے قریب اور دعوتی اسلام سے دور ہے۔

الرسالہ مشن کا خاص مقصد "دعوتی اسلام" کو دلائل کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہے تاکہ امت کا ذہین اور باشعور طبقہ دعوتی اسلام کی اہمیت کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس مہم میں لگائے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کیوں کہ امت کا طبقۂ خواص جب تک دعوتی مشن میں نہ لگے، صرف طبقۂ عوام کی بنیاد پر کوئی گہری تحریک برپا نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی بڑی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

"دعوتی اسلام" کے موجودہ طریقہ کے ذریعہ محدود معنوں میں عوام کے اندر کچھ اصلاح کا کام

کیا جاسکتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ اسلام کی ازسرنو تاریخ بنانے کا ہے جس کو تجدید دین کہا جاتا ہے۔ اور حقیقی تجدید دین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وقت کے اہل فکر اور اہل علم کو دعوتی اسلام کا حامی نہ بنایا جائے۔

مقالات اور سوال وجواب کے بعد میری تفصیلی تقریر ہوئی۔ میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمپوزیم گویا میرے خواب کی تعبیر ہے۔ پندرہ سال پہلے الرسالہ کے نام پر سمپوزیم کیا جاتا تو شاید چند آدمی بھی جمع نہ ہوتے۔ کیوں کہ اس وقت الرسالہ ایک غیر معروف لفظ تھا۔ آج الرسالہ اور اس کا مشن ایک معروف عام لفظ بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "الرسالہ سمپوزیم" کو اتنی کامیابی کے ساتھ منعقد کرنا ممکن ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

پھر میں نے کہا کہ آج کی ایک خاتون مقالہ نگار انسوترا چودھری نے اپنے مقالہ میں کہا ہے کہ الرسالہ کا مقصد کرکٹ تھنکنگ (correct thinking) پیدا کرنا ہے۔ یہ الرسالہ کے مشن کی صحیح ترجمانی ہے۔ ہمارا خاص مقصد یہی ہے کہ لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا ہو۔ وہ مسائل کے بارہ میں صحیح زاویہ سے رائے قائم کریں اور فطرت کے سچے اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر اس عام مسئلہ کو لیجئے جو تمام لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ بہت سے لوگ اس مسئلہ کو ایک فرقہ کے اوپر دوسرے فرقہ کا تعصب اور زیادتی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کرکٹ تھنکنگ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعصب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا چیلنج ہے۔ اور یہ چیلنج ہمیشہ باقی رہے گا۔

قرآن اور تاریخ کی تفصیلات دیتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کا نظام مقابلہ اور چیلنج کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ چیلنج ترقی کا زینہ ہے۔ چیلنج سے صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ وہ افراد اور قوموں کو معمولی حالت سے اٹھا کر غیر معمولی حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم تعصب اور امتیاز کے الفاظ کو اپنی ڈکشنری سے نکال دیں۔ ہم اپنے مسائل کو چیلنج کی حیثیت سے دیکھیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی اور چوائس نہیں۔ کیوں کہ زندگی کا یہ مقابلاتی نظام خود خالق نے

قائم کیا ہے۔ اور ہم کسی بھی حال میں اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔

غلط سوچ ہو تو آدمی کو زندگی میں صرف مشکلیں ہی مشکلیں دکھائی دیں گی۔ لیکن اگر صحیح سوچ ہو تو آدمی مواقع کو دیکھ لے گا اور ان کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائے گا (یہ تقریر ان شاء اللہ مرتب کرکے مقالہ کی صورت میں شائع کر دی جائے گی)

میری تقریر کے بعد کنوینر مسٹر ایم ٹی خان نے چند کلمات کہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے اس اجتماع میں مسلمان بھی ہیں، اور ہندو بھی ہیں، سکھ بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کوئی فرقہ وارانہ مشن نہیں ہے۔ وہ مین کائنڈ کے لئے اور پوری انسانی برادری کے لئے ہے۔ وسیع ہال کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ وہ تقریباً چار گھنٹہ تک کھڑے ہو کر تمام کارروائی سنتے رہے۔ مسٹر خان نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: آپ کی اسٹینڈنگ پوزیشن ہمارے لئے آوٹ اسٹینڈنگ ریمائنڈر ہے۔ آئندہ ہم ان شاء اللہ اس کا خیال رکھیں گے۔

اس کے بعد صدر جلسہ ڈاکٹر شری نواس کھڑے ہوئے اور اپنی اختتامی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی برجستہ تقریر ان الفاظ کے ساتھ شروع کی: آپ بسواس کیجئے۔ میں نے خود الرسالہ پڑھا ہے۔ اتنی بڑھیا کتاب آج ہمارے یہاں کوئی اور اپلبدھ نہیں ہے۔ چاروں طرف جو اندھیارا چھایا ہے اس میں ایک چاند ہی نہیں نکلا بلکہ ایک سورج نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری چیلنج والی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ سڑک بالکل شیشہ کی طرح چکنی ہو تو اس پر گاڑی نہیں چلے گی۔ سڑک پر فرکشن (friction) ہونا چاہئے، تبھی گاڑی چل سکتی ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔

آخر میں جناب سید مشہدی صاحب نے ووٹ آف تھینکس (اظہار تشکر) پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ اجتماع ایک تعمیری اجتماع تھا۔ مزید اس میں "سوال وجواب" کے وقفہ کے دوران یہ ایک بہت اچھی چیز سامنے آئی کہ ہمارا نوجوان طبقہ اپنے بزرگوں سے سوال کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ یہ الرسالہ کے ذریعہ بہت اچھی سیکھ ہمارے نوجوانوں کو ملی ہے۔

گورنمنٹ اردو لائبریری کے جس ہال میں یہ اجتماع ہوا، اس کے ذمہ داروں نے الرسالہ سمپوزیم کے سلسلہ میں اپنا مکمل تعاون دیا۔ ادارہ کے صدر ڈاکٹر عبد الحی صاحب نے سمپوزیم کو لائبریری فنکشننگ کا جزء قرار دیا۔ انھوں نے ہدایت جاری کی کہ اس سمپوزیم کو لائبریری کے کوبیبریشن میں ہونے والا

اجتماع سمجھا جائے۔ انھوں نے مذکورہ تاریخ کو آدھے دن کے لئے لائبریری بند کر دی تاکہ سمپوزیم کی کارروائی بآسانی جاری رہ سکے۔

لائبریرین ڈاکٹر محمد نظام صاحب اور ان کے اسٹاف کے دوسرے ممبروں کا بھرپور تعاون سمپوزیم کے منتظمین کو حاصل رہا۔ انھوں نے کھلے دل سے اس کے حسن انتظام کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا اجتماع اب تک لائبریری ہال میں کوئی نہیں ہوا تھا۔ یہ سمپوزیم نہ صرف پربزوردی ہے بلکہ وہ ریکارڈ ڈوردی بھی ہے۔

سمپوزیم کے منتظمین نے ہال کو "الرسالہ اورینٹل ہال" بنادیا تھا۔ ہال میں چاروں طرف الرسالہ کے صفحہ اول کے اقوال اردو، ہندی اور انگریزی میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جلی حرفوں میں لکھ کر دیواروں پر لگائے گئے تھے۔ مثلاً یہ قول کہ ـــــ کوئی آدمی کسی کا چراغ نہیں بجھاتا، چراغ کے اندر تیل کی کمی چراغ کو بجھا دیتی ہے، وغیرہ۔ اس طرح ہال میں ہر طرف الرسالہ کا ماحول قائم ہوگیا تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں جب یورپ میں سائنس کا رواج ہوا تو سائنس لوگوں کے درمیان فیشن کی طرح پھیلنے لگی۔ ہر گھر گویا ایک تجربہ گاہ بن گیا جہاں چھوٹے اور بڑے لوگ طرح طرح کے سائنسی تجربات میں معروف رہتے تھے۔ ہر طرف سائنس کا چرچا پھیل گیا۔ یہاں تک کہ وہ واقعہ پیش آیا جس کو سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ الرسالہ کا مشن بھی اسی طرح گھر گھر اور بستی بستی میں پھیل جائے۔ لوگ اس کے بارہ میں سوچیں، اس کے اوپر مذاکرے کریں، اس کے انداز پر مطالعہ کریں۔ اس کی بنیاد پر اجتماعات کریں۔ الرسالہ کی تحریک ایک لہر کی صورت اختیار کرلے۔ یہ لہر بڑھتی رہے یہاں تک کہ پوری ملت کے اندر ایک مکمل فکری انقلاب آجائے۔

پٹنہ کے ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ وہ "الرسالہ لائبریری" قائم کریں گے۔ ماہانہ اجتماع کا سلسلہ شروع کریں گے۔ اسٹڈی سرکل کی صورت میں کام کو آگے بڑھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

۲۹ جولائی کی شام کو دوبارہ مگدھ ایکسپریس سے واپسی ہوئی۔ ٹرین میں رات کو سورہا تھا کہ خواب دیکھا کہ میں کسی مکان کی چھت پر ہوں اور وہاں تیز زلزلہ آگیا ہے۔ دیر تک پورا مکان ہلتا رہا۔ میں

مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ کہہ رہا ہوں کہ یا اللہ، کیا ہونے والا ہے۔

یہ محض خواب تھا، کوئی حقیقی زلزلہ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ اس وقت جب کہ میں سو رہا تھا، ٹرین مسلسل ہل رہی تھی۔ میری آنکھ اور میرا شعور نیند کی وجہ سے معطل تھے۔ مگر میرا لاشعور ٹرین کے ہلنے کو محسوس کر رہا تھا۔ اسی مجہول احساس کو میں نے خواب میں زلزلہ کی صورت میں دیکھا۔

پھر یاد آیا کہ پٹنہ میں جناب مصطفیٰ کمال صدیقی نے کہا تھا کہ الرسالہ مشن کا ساتھ دینے کے لئے اس چیز کی ضرورت ہے جس کو "اللہ اکبر" میں زلزلہ درکار ہے (صفحہ ۶۲) کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنے اندر زلزلہ لانے کے لئے تیار نہیں، اسی لئے وہ الرسالہ کا ساتھ دینے کے لئے بھی تیار نہیں۔

مجھے کمال صدیقی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ الرسالہ نبأ عظیم کا نقیب ہے۔ اس کے قافلہ میں صرف وہ روحیں شریک ہو سکتی ہیں جو قیامت سے پہلے اپنے آپ کو قیامت کے میدان میں کھڑا ہوا دیکھیں۔ جن کی حساسیت کا یہ حال ہو کہ حقیقی بھونچال تو درکنار، پتہ کا کھڑکنا اور سواری کا ہلنا بھی ان کے لئے زلزلۃ الساعہ کی پیشگی خبر بن جائے۔ ایسے ہی لوگ الرسالہ مشن کا ساتھ دیں گے۔ اور امکانی طور پر آج بھی ایسے بے شمار لوگ خدا کی دنیا میں موجود ہیں۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۱ کی دوپہر کو میں دہلی واپس پہنچا۔

دہلی واپسی کے بعد پٹنہ سے متعدد خطوط اور پیغامات موصول ہوئے۔ یہاں ان میں سے چند خط کے کچھ حصے نقل کئے جاتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر شری نواس صاحب (تری بھون ہیلتھ سنٹر، پٹنہ) نے الرسالہ انگریزی کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کتب بھی انھوں نے مطالعہ کے لئے حاصل کی ہیں۔ ان کے خط مورخہ یکم اگست ۱۹۹۱ کا ایک پیراگراف یہاں ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:

> I consider it a great privilege to have met such a noble intellectual as yourself. It was indeed a treat to have listened to your fine and brilliant discourse. Your novel approach to our social and communal problems is most welcome. (Dr. Shreenivas)

جناب محمد کمال صدیقی (اورینٹل بینک آف کامرس، پٹنہ) اپنے تفصیلی خط مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں :

" آپ سے ملنے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ جس آدمی سے میری ملاقات تحریری طور پر ہوتی ہے وہ کتنا کامپلکس (complex) ہے، اور اسی آدمی سے جب میری ملاقات براہ راست ہوتی ہے تو وہ کتنا سمپل (simple) ۔ بولنے میں آپ جس قدر کم سخن ہیں شاید اسی وجہ سے کہ سوچنے کے اعتبار سے آپ گہرے ہیں۔ دو چیزیں میں آپ سے اپنے اندر منتقل کر رہا ہوں ۔ ایک صبر اور دوسرا فکر ۔ اور جب بھی کسی معاملہ میں میں صبر سے کام لیتا ہوں تو میرا اعتماد اپنے آپ میں اور خدا میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دراصل میں آپ کی کتابیں پڑھتا ہوں تو اپنی فطرت کو سراسر اس کے مطابق پاتا ہوں۔ اور کچھ واردا تیں بھی میرے ساتھ ایسی گزری ہیں کہ میرا دل آپ کے ذریعہ بتائے گئے دین اسلام کی تصدیق کرتا ہے۔ بھونچال کی شکل میں میں نے اپنی پچھلی زندگی کو خیرباد کہا ہے اور پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ لیا کہ اگلی زندگی کو دین پر چلانا ہے۔ پہلے میں گالیوں سے یا لوگوں کی اوچھی حرکتوں سے بدظن ہو جایا کرتا تھا اور جواب میں ایسی حرکتیں کر جاتا تھا جو تمام تر ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اب یہ سب چیزیں میرے نزدیک مینگ لس (meaningless) ہوگئی ہیں۔ ان باتوں پر بے چینی تو اب بھی ہوتی ہے۔ مگر اب وہ لوگ جو اوچھی حرکتیں کرتے ہیں معذور نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ مجھے جو معلوم ہے وہ ان کو معلوم نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگوں کو برتر حقیقتوں سے باخبر کیا جائے۔ " اللہ اکبر " پڑھ کر میں نے جانا کہ اللہ سے قریب ہونے کی ایک قیمت ہے جس کو ہمیں ادا کرنا ہے ... ویسے جنت کی کنجی تو آپ سونپ گئے ہیں۔ دیکھئے اس کا بوجھ اٹھانے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔"

مسٹر ایم ٹی خان (عدالت گنج، پٹنہ) کا چار صفحہ کا خط موصول ہوا ہے۔ انھوں نے کئی ضروری باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ پٹنہ کے الرسالہ سمپوزیم میں جن افراد نے فکری اور عملی تعاون دیا تھا، ان سب کے نام اسلامی مرکز کی طرف سے شکریہ کا خط جانا چاہئے تھا جو ان کو نہیں بھیجا گیا۔ یہ واقعی ہمارے لئے کوتاہی کی بات ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں سے گزارش کریں گے کہ وہ ہماری اس

کوتاہی پر درگزر فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا مخلصانہ تعاون کسی رسمی شکریہ سے بلند ہے۔ تاہم ہمارا یہ اسلامی فرض ہے کہ ہم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کریں (من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

الرسالہ سمپوزیم پٹنہ کے ساتھیوں کی طرف سے بلاشبہ ایک کامیاب اقدام تھا۔ اس کے بعد پٹنہ میں کام کی طرف نئی حرکت شروع ہوئی ہے۔ الرسالہ کا پیغام پہلے سے زیادہ لوگوں کے درمیان زیر بحث آرہا ہے۔ روزنامہ صدائے عام (پٹنہ) نے الرسالہ کا مضمون اپنے کالموں میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سمپوزیم کی خبروں کو اکثر اخبارات شائع کرتے رہے ہیں۔ قارئین الرسالہ کی تعداد مقامی طور پر بڑھ رہی ہے۔ مسٹر ایم ٹی خان نے اپنی رہائش گاہ پر لائبریری قائم کی ہے جس میں الرسالہ مشن کی تمام کتابیں برائے مطالعہ رکھی گئی ہیں۔ وغیرہ

مزید یہ کہ پٹنہ میں باقاعدہ طور پر ماہانہ اجتماع بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ اجتماع پروفیسر سید شہاب الدین دسنوی کی رہائش گاہ پر ہوتا ہے۔ اس کا وقت ہر مہینہ کے سکنڈ سنڈے کو پانچ بجے شام ہے۔ پورا پتہ اور ٹیلیفون نمبر یہ ہے:

Prof. S. Shahabuddin Desnavi, Taj Manzil,
Chajju Bagh, Patna 800 004 (Tel. 224252)

چوں کہ الرسالہ میں پٹنہ سمپوزیم کی خبر مسٹر ایم ٹی خان کے پورے پتہ کے ساتھ پیشگی شائع ہوئی تھی، اس لئے ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے اس سلسلہ میں کئی حضرات نے مسٹر ایم ٹی خان سے رجوع کیا اور معلومات دریافت کیں۔ مسٹر خان نے ان لوگوں کو بذریعہ خط اپنا جواب بھیج دیا ہے۔

مسٹر ایم ٹی خان نے مطلع کیا ہے کہ سمپوزیم کے بعد لوگوں نے مختلف سوالات کئے۔ انھوں نے بطور خود ان سوالات کا جواب بھی دیا۔ یہاں کچھ سوالات مع جواب نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ جب قرآن ایک الہامی کتاب ہے اور ہمارے پیغمبر نے اس کی تعلیم کو پوری طرح پھیلا دیا ہے اور اس کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر بھی کر دیا ہے تو اب آپ ہم کو ایمان ڈسکور کرنے کا مژدہ کیوں دے رہے ہیں۔

جواب : یہاں ڈسکوری کے لفظ سے وہی چیز مراد ہے جس کے لئے قرآن وحدیث میں معرفت کا لفظ آیا ہے۔ قرآن وسنت میں اسلام بلاشبہ موجود ہے۔ مگر ایک انسان جب اپنی ذات کی سطح پر اس کی معرفت حاصل کرتا ہے تو وہ اس کے اپنے لئے ڈسکوری کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے اسی قسم کا ایک نفسیاتی تجربہ ہوتا ہے جس کو ڈسکوری یا انکشاف کہا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ صبر واعراض کی تلقین بظاہر درست ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ صبر و اعراض کب تک۔ آخر اس کی حد (limit) کیا ہوگی۔

جواب : حد کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ صبر و اعراض کو شعوری طور پر اور شرح صدر کے ساتھ اختیار کیا جائے اور اس کا واقعۃً تجربہ کیا جائے۔ ابھی تو لوگوں نے صبر واعراض کو شعوری طور پر اختیار ہی نہیں کیا اور نہ اس کا واقعی معنوں میں تجربہ کیا۔ ایسی حالت میں حد کا سوال ابھی قبل از وقت ہے۔

مزید یہ کہ حد کا سوال محض ایک فرضی اندیشہ ہے۔ اعراض کا طریقہ اگرچہ ابھی تک عمومی طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ مگر بہت سی انفرادی مثالیں موجود ہیں جب کہ اعراض کا طریقہ اختیار کیا گیا اور فساد کا بم فور اُ ڈیفیوز ہو کر رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اعراض کا طریقہ مسئلہ کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیتا ہے۔ پھر حد کا سوال کہاں پیدا ہوگا۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ بات قابل تشویش ہے کہ آپ اکثر آرگنائزر، پانچ جنیہ وغیرہ میں چھپتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں۔

جواب : اس معاملہ میں صحیح اصول یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ کہاں چھپا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ کیا چھپا۔ آپ ان پرچوں میں چھپے ہوئے مضامین کو پڑھیں۔ آپ پائیں گے کہ ان میں عین وہی بات کہی گئی ہے جو الرسالہ میں برابر شائع ہوتی رہی ہے۔ پھر اس پر اعتراض کس لئے۔ یہ تو خوشی ہونے کی بات ہے کہ الرسالہ کا تعمیری پیغام اس طرح زیادہ وسیع حلقوں میں پھیل رہا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کا خلیج نمبر شائع کر کے آپ نے صدام حسین کی غلطیوں کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن اب جنگ بند ہونے کے بعد صدام حسین پر طرح طرح کی زیادتیاں کی جارہی ہیں لیکن آپ اس کے بارہ میں چپ ہیں۔ ایسا کیوں۔

جواب: جب ایک شخص کوئی سنگین غلطی کرے تو اس کا انجام غلطی کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ غلطی کوئی شخص کرے اور اس کا برا انجام کوئی دوسرا شخص بھگتے۔ یہ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صدام حسین نے جارحیت کی، اور جو شخص جارحیت کرتا ہے اس کو بہرحال اس کا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ صاحب الرسالہ خدا کو دیکھنے اور چھونے کی بات کرتے ہیں۔ کیا واقعی انھوں نے خدا کو دیکھا ہے اور چھوا ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیسے۔

جواب: اس قسم کی ہر بات مجازی معنوں میں کہی جاتی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ مثلاً اقبال کی ایک نظم "شکوہ، جواب شکوہ" ہے۔ اس میں اقبال خدا کے ساتھ اپنی تفصیلی گفتگو کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ خدا سے باقاعدہ سوال کرتے ہیں اور خدا ان کے سوالات کا انھیں براہ راست جواب دیتا ہے۔ اس گفتگو کو اگر بالکل لفظی معنی میں لے لیا جائے تو وہ حد درجہ غلط قرار پائے گی۔ کیوں کہ اس قسم کی گفتگو تو خدا اور پیغمبر کے درمیان بھی نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی واقعۃً خدا سے بات چیت ہوئی۔ یہ پورا کلام بطور مجاز یا استعارہ ہے نہ کہ بطور حقیقت۔

یہ معروف مجازی (metaphorical) اسلوب ہے۔ یعنی ایک احساس کو موثر بنانے لئے اس کو واقعہ کی زبان میں بیان کرنا۔ اس قسم کے مجازی اسلوب کی مثالیں دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں اور اسلامی ادب میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اس اسلوب کو کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا اور نہ آج کوئی سنجیدہ اور صاحب علم شخص اس کو قابل اعتراض بتا سکتا ہے۔

"شکوہ اور جواب شکوہ" کی نظم کو اگر بیان واقعہ کے طور پر لیں تو یہ نظم سخت قابل اعتراض دکھائی دے گی۔ مگر جب اس نظم کو ایک شعری اسلوب سمجھ کر پڑھیں تو وہ عین درست نظر آتی ہے۔ یہی معاملہ الرسالہ میں چھپنے والے مضمون کا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس میں ایک حقیقی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ آپ کی نظر میں قابل اعتراض بن جائے گا۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھ کر اس کو پڑھیں کہ یہ ایک ادبی اسلوب ہے تو وہ آپ کو سراسر درست نظر آئے گا۔

مسٹر ایم ٹی خان مزید اپنے خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں کہ سمپوزیم کی رپورٹ کا ترجمہ

کر کے اس کو انگلش اور ہندی الرسالہ میں بھی شائع کر دیں۔ اس سے وہ بات اچھی طرح نمایاں ہو جائے گی جو آپ نے سمپوزیم کی بابت اپٹنہ میں کہی تھی۔ یعنی : Patna shows the way

۱۳ ستمبر ۱۹۹۱ کو مجھے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے "تعمیر و ترقی، سماجی انصاف" کے عنوان پر ٹاک وارمنٹ بولنے کا وقت دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹاک میں الرسالہ کے بنیادی اصولوں کو وہاں اجاگر کیا۔ اگلے دن اسے براڈ کاسٹ کیا گیا۔

کئی لوگوں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ کنوینر نے صرف سادہ طور پر سمپوزیم کی کارروائی کو چلایا ہی نہیں بلکہ ہر دو تقریر کے بیچ میں لوگوں کی دل چسپی قائم رکھنے کے لیے ہلکی ہلکی خوراک بھی دیتا رہا۔ دوسرے مقامات پر سمپوزیم کا پروگرام ہو تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تاکہ لوگوں میں اکتاہٹ پیدا نہ ہونے پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ پٹنہ کا الرسالہ سمپوزیم ہر لحاظ سے ایک کامیاب تجربہ تھا۔ اس نے علامتی طور پر الرسالہ مشن کے موجودہ مقام کو بتایا۔ نیز اس نے اس مشن کے لیے کام کرنے کی نئی راہیں کھولیں۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات کے لوگ اس سے سبق لیں اور ہر جگہ اپنے حالات کے لحاظ سے اس قسم کے تجربے کریں۔

۱ ۲۰ جولائی ۱۹۹۱ کو نظام الدین (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر "دین کی حقیقت" کے بارہ میں مختصر خطاب کیا۔

۲۔ یوم آزادی (۱۹۹۱) کے پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس کا موضوع "آزادی اور ہماری ذمہ داریاں" تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ آزادی کے ساتھ اگر اخلاقی پابندی کو نہ قبول کیا جائے تو آزادی دوبارہ نئے قسم کی غلامی بن جاتی ہے۔

۳ نیویارک سے جناب کلیم الدین احمد صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ میشی گان کے ایک ۲۲ سالہ امریکی نومسلم مسٹر یحییٰ ایمرک (Yahya Emerick) کو انگریزی الرسالہ کے کچھ پرچے ملے۔ اس کو پڑھ کر انھوں نے اتنا پسند کیا کہ اپنے پانچ امریکی دوستوں کے نام اپنی طرف سے انگریزی الرسالہ جاری کرایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی کتابیں، گاڈ ارائزز وغیرہ منگائی ہیں اور بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صحیح معنوں میں "دعوہ میٹریل" اسلامی مرکز کے لٹریچر میں ملتا ہے۔

۱ ایم کے۔ کمال الدین صاحب کیرالا کے باشندے ہیں وہ ۱۹۶۳ سے دبئی میں رہتے ہیں اور وہاں نیو انڈین ماڈل اسکول کے چیرمین ہیں۔ وہ اپنے انگریزی خط مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۱ میں لکھتے ہیں: "میں پچھلے پانچ برسوں سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے اندر ہر کسی کے لئے عمدہ اخلاقی سبق ہوتے ہیں۔ تری وندرم (کیرالا) میں میرا ایک پرنٹنگ پریس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں سے ماہنامہ الرسالہ کو ملیالم زبان میں شائع کروں امید ہے کہ آپ اس کی اجازت عنایت فرمائیں گے۔" کمال الدین صاحب کو اسلامی مرکز کی طرف سے الرسالہ ملیالم اڈیشن نکالنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

مسٹر پرویز اختر (آرہ) نے بتایا کہ وہ تجارت کے سلسلہ میں اکثر فیروز آباد جاتے رہتے ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات ایک ہندو تاجر مسٹر اروند سے ہوئی۔ مسٹر اروند نے بتایا کہ وہ الرسالہ سے اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ اس کو اس کی اصل زبان میں پڑھنے کے لئے انھوں نے اردو سیکھی

ہے اور اب وہ الرسالہ اردو کو روانی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی کئی لوگ ہیں جنھوں نے الرسالہ کو پڑھنے کے لئے اردو سیکھی ہے۔

۶ محمد ہارون صاحب (بر ہم پور، مرشد آباد) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ الرسالہ کے مضامین کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرکے ان کو بنگالی اخبارات و رسائل میں چھپواتے رہتے ہیں۔

۷ حیدر آباد (پاکستان) کے پندرہ روزہ اخبار "تحریر و تصویر" نے اپنے شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۹۱ء میں الرسالہ کے بارہ میں ایک مفصل تائیدی مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا گیا ہے: ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن مولانا وحید الدین خاں کا کلمۂ حق" ہند اور بیرون ہند کے مختلف اخبارات و رسائل میں اس طرح کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

۸ اس سے پہلے مسلم مسائل میں صرف احتجاج اور شکایت اور مظلومیت کی زبان بولی جاتی تھی۔ الرسالہ کی پندرہ سالہ متواتر کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ اب تمام لوگوں کی زبانیں بدل رہی ہیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی طور پر الرسالہ کا پیٹرن اختیار کر رہا ہے۔ اس کی ایک مثال لکھنؤ کے پندرہ روزہ تعمیر حیات کی ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ اگست ۱۹۹۱ کے اداریہ کا عنوان "روشن مستقبل" ہے اور وہ پورا کا پورا الرسالہ کے نقطۂ نظر کی نقل ہے۔

۹ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا برابر ۱۹۸۵ سے قاری ہوں۔ اور بہت ہی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ الرسالہ کا ہر لفظ موتی اور ہیرے کے برابر ہوتا ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر عمل کرے تو یقیناً ہم کو جینے کا طریقہ حاصل ہو جائے۔ خاص کر اعراض کا جو سبق آپ دے رہے ہیں وہ بہت ہی قیمتی سبق ہے۔ مگر نادان لوگ اس کو بزدلی بتاتے ہیں اور برابر خود ہی نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہاں کی مسجد میں تذکیر القرآن بھی موجود ہے۔ وہ واقعی اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کہ لوگ تبدیل ہوں گے اور الرسالہ کی نصیحت پر عمل کریں گے۔ (مبارک حسین، اعظم گڈھ)

۱۰ ایک خاتون لکھتی ہیں: میں مقامی ایجنسی سے ہر مہینے الرسالہ حاصل کر لیتی ہوں۔ اس کے مضامین بہت جاندار ہوتے ہیں۔ بہت سی نئی نئی باتیں سیکھتی ہوں۔ ملنے جلنے والوں کو الرسالہ پڑھنے کی ترغیب دیتی رہتی ہوں۔ کچھ ہندو صاحبان کو الرسالہ کے نسخے تقسیم کئے۔ کچھ لوگوں کو فوٹو کاپی

کرا کے دیا (آمنہ منظر، کشن گنج)

۱۱ میڈیکل کے ایک طالب علم لکھتے ہیں: میں ۱۹۸۰ سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ میں نے پایا کہ الرسالہ نے کئی نوجوانوں کے ذہن کو تعمیری سوچ کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مشن کو کامیاب کرے جو مسلمانوں کو ایک پچھڑی ہوئی زندگی اور ناکامی سے بچانے کے لئے جاری ہے۔ ہمارے کالج میں تقریباً ۳۰ مسلم طلبہ ہیں۔ ہم یہاں کئی مشکلوں سے آسانی سے نکل آئے۔ اور اب یہاں ہماری پوزیشن بہت اچھی ہے۔ کیوں کہ ہم نے آپ کے بتانے کے مطابق "حدیبیہ پرنسپل" کو استعمال کیا (محمد انور رنجی، اورنگ آباد)

۱۲ قاری سید مبین صاحب ناندیڑ میں مستان پورہ کی مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد وہ مسجد میں تذکیر القرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔ بیشتر نمازی درس سننے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کا وقت لگتا ہے۔ لوگ بہت شوق سے سنتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مساجد میں تذکیر القرآن کے ذریعہ درس قرآن کا سلسلہ قائم ہے۔

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ نظروں سے گزرا۔ شکر خداوندی ہے کہ اس نے آپ جیسے دینی قناعت پسند شخصیت کے ہاتھوں سے اتنا مدبر رسالہ جاری کروایا ہے۔ واقعی یہ رسالہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ عام و خاص انسانوں کے لئے ایک بہترین عطیہ ہے۔ ایک مشعل راہ ہے (حسین خاں، بنگلور)

۱۴ ۱۵ اگست 1991 کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا: سماجی اصلاح کا مسئلہ۔

۱۵ عبد الرحمٰن صاحب (پونہ) الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں الرسالہ پڑھنے کے بعد یہ کرتا ہوں کہ اس کے منتخب مضامین کو ہندو لوگوں کو سناتا ہوں۔ وہ لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ خود پڑھنے کے بعد دوسروں کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

۱۶ ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام کاروان ملت ہے۔ اس کا موضوع ملت کا احیاء نو ہے اور وہ ۲۲۴ صفحہ پر مشتمل ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے تک) پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ " "	۱۸ " "
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ " "	۲۵ " "
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ " "	۴۰ " "
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ "	— —

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

RNI 28822/76 December 1991 No. 181 Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	15/-
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	30/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسول	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-
इन्सान! अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/-

Delhi Postal Regd No. D(SE)243
U(SE)12/86

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳